مطالعہ ادیانِ عالم سیریز نمبر 60

الحاد اور جدید ذہن کے سوالات

مصنّف: حافظ محمد شارق

معاون مصنف: سید اسرار احمد بخاری

ادارہ تحقیقات

اس کتاب کے حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

All Rights Reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system, or transmitted, in any form or by any means, electronic, mechanical, photocopying, recording, or otherwise, without the prior written permission of Author.

خلاف ورزی کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔

نام کتاب	:	الحاد اور جدید ذہن کے سوالات
تصنیف	:	حافظ محمد شارق/سید اسرار احمد بخاری
سال اشاعت	:	2021ء
سال اشاعت دوم	:	2022ء
اشتراک	:	ادارہ تحقیقاتِ مذاہب
اہتمام:	:	محمد خلیل ملک ککے زئی
قیمت:	:	00.0000روپے

التماس: اللہ ربّ العزت کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، اور طباعت میں حد درجہ احتیاط کی گئی ہے۔ تاہم غلطی کا احتمال بہر حال باقی رہتا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کہیں بھی غلطی یا خامی نظر آئے تو ازراہِ کرم مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل میں لائی جاسکے۔ اِدارہ ''بسم اللہ بک ہاؤس'' کے متعلقین اپنے کرم فرماؤں کے تعاون کے لیے بے حد شکر گزار ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ بک ہاؤس

اُردو بازار، کراچی

محمد خلیل ملک: 0312-2846175, 0303-2353839

مصنف کی دیگر اہم کتب

- مطالعہ مذاہب
- تفہیمِ مذاہب
- مذہب اور انسان: عصری تناظرات
- انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ؛ قرآن اور جدید علم الآثار کی روشنی میں
- ہندومت کا تفصیلی مطالعہ
- ہندومت اور اسلام، مشترکہ اقدار اور تعامل کی تاریخ
- سورۃ الفاتحہ کے تناظر میں فلسفہ و مذاہب کا مطالعہ
- قرآن مجید اور ہماری شخصیت
- ہندو اور اسلامی فلسفے میں مابعد الطبیعات
- منطقی مغالطے

فہرست

تعارف 11

تاریخ 14

الحاد کا تعارف 15

الحاد Atheism 16

الحادِ مطلق (Gnosticism) 16

لاادریت (Agnosticism) 17

ڈیزم (Deism) 17

موجودہ الحاد کی تاریخ 18

اقوام عالم پر الحاد کے اثرات 25

الحاد، جدید دور میں 29

ملحدین کے افکار 31

اصول و مبادی 37

ماورائے ادراک اور خلاف عقل 38

معیارِ قبولیت 40

ذرائع علم 42

ثبوت اور نظیر 45

الحاد اور منطقی مغالطے 47

خدا، مذہب اور سائنس 51

مذہب اور جدید سائنسی استدلال 52

مذہب اور سائنس کی قطعیت 60

سائنس اور انکارِ خدا 66

نظریۂ ارتقا اور خدا 70

کیا خدا قوتِ محرکہ ہے؟ 73

ڈیزم اور تصور خدا 76

خدا اور مذہب کی ضرورت 82

کیا سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟ 85

خدا اور کائنات کی ازلیت 88

تخریب میں تعمیر 90

کیا کائنات اتفاقی حادثہ ہے؟ 95

ملحدین کے عمومی سوالات 99

خدا کا خالق کون؟ 100

خدا نظر کیوں نہیں آتا 103

بن دیکھے خدا پر یقین کیوں؟ 105

دنیا میں شر کیوں ہے؟ 108

قدرتی آفات کیوں آتی ہیں 111

خدا کی عبادت کیوں کی جاتی ہے؟ 113

خدا کی رحمت اور عذاب 115

مذہب انسانی آزادی پر قدغن کیوں لگاتا ہے؟ 118

مذاہب میں اختلاف کیوں؟ 120

ضمیمہ 122

شہد کی مکھی 123

کائنات کا نظم اور وجود خداوندی..... 126

الحاد کی وجوہات اور اس کے سد باب کی حکمت عملی 128

یورپ میں الحادی فکر کے محرکات اور موجودہ مسلمان..... 129

مذہب بیزاری کی وجوہات اور اس کے تدارک کی حکمت عملی 140

ملحدین کو دعوتِ دین 146

عوام الناس کی ذمہ داری 154

سوشل میڈیا پر گستاخانہ مواد اور ہمارا ردعمل 157

میں خدا پر کیوں یقین رکھتا ہوں؟ 162

مسلمانوں کا نشاۃ ثانیہ اور اس کا لائحہ عمل 174

مصنفین کا تعارف

حافظ محمد شارق

حافظ محمد شارق مشہور نوجوان ماہر الٰہیات ہیں۔ فلسفہ و مذاہب کے میدان میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ کم عمری میں ہی اس موضوع پر وہ سند سمجھے جاتے ہیں۔ آپ ملکی و غیر ملکی جامعات میں مذاہب، الٰہیات اور روحانیت پر لیکچرز دے چکے ہیں، معیاری جرائد میں تحقیقی مقالات اور متعلقہ موضوعات پر بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

صاحبانِ علم کو یہ بات بھی حیران کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ابھی ان کی عمر محض چھبیس برس ہے لیکن پاکستان بھر کی مختلف جامعات میں ان کے تحقیقی کاموں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر مقالات لکھے جارہے ہیں۔ اس نوجوانی میں اس کا علمی و فکری مقام، سنجیدگی اور کارنامے یقیناً بے نظیر ہیں۔ خدا بہت برکتوں سے نوازے لمبی عمر دے۔ آمین

ڈاکٹر عنیزہ سید

سینٹر فار سوشل ریسرچ، ناروے

سید اسرار احمد بخاری

سید اسرار احمد بخاری کا تعلق کراچی سے ہے اور آپ پیشے کے اعتبار سے اکاؤنٹنٹ ہیں۔ آپ نے معاشیات میں ماسٹرز اور ACCA کی ڈگری حاصل کی ہے۔ جدید علوم کے علاوہ آپ مذہبی و سماجی علوم پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر الحاد کے رد کے حوالے سے نمایاں ایکٹوسٹ میں شامل ہیں اور مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین ملکی و غیر ملکی جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ الحاد کے حوالے سے یہ آپ کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔

انتساب

تشکیک کی پُر خار جھاڑیوں میں پھنسے

ہر طالبِ صادق کے نام

تعارف

عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا کے آغاز کے بعد سے الحاد کا پھیلاؤ جس شد و مد سے زیر بحث ہے اور جس طرح سے الحادی افکار نے ہر سوچنے والے ذہن کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے، اس کی مثال گزشتہ ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس سے قبل الحاد نے اگرچہ علمی اور فلسفیانہ ذہن رکھنے والے اہلیان علم کی ایک محدود تعداد کو ضرور متاثر کیا تھا تاہم اس کی حیثیت اعتقادی یا سماجی سے زیادہ علمی و فلسفیانہ نوعیت کی تھی۔ مغربی ممالک میں الحاد تقریباً دو سو سال قبل فاتحانہ داخل ہو چکا تھا تاہم مشرقی معاشروں میں اس کی پیش قدمی اور پھیلاؤ اس سرعت سے نہیں ہو سکا تھا جیسا انٹرنیٹ اور بالخصوص سوشل میڈیا کے زبردست پھیلاو کے نتیجے میں ہوا۔

ہمارے مطالعے اور تجزیے کے مطابق جدید دنیا کے آغاز سے ہی ہر معاشرے میں ملحدین اور الحادی گروہوں کا وجود کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے اور ان کی تعداد بھی کم و بیش ایک سی رہی ہے۔ تاہم سائنسی علوم کی بے پناہ ترقی اور ان علوم پر بے خدا نظریات کی حکمرانی نے دورِ حاضر میں خدا و مذہب کے ماننے والوں کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دور حاضر میں علم کا ارتقاء اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ علمی دنیا میں الحاد نے اب ایک اپروچ اور ایک طرز مطالعہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اور صورتحال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مذہب، خُدا اور تمام مذہبی تصورات کو

مذہبی توجیہات کے بجائے انسانی علوم سے دریافت شدہ ''علمی حقیقتوں'' کی بنیاد پر دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بشریات سے لے کر علم الآثار تک اور سائنس سے لے کر ٹیکنالوجی تک ہر ہر علم بے خدا علم ہے۔ آپ بشریات اور علم الآثار کا ابتدائی مطالعہ ہی کر کے دیکھ لیجیے انسانی معاشرے کے تہذیبی ارتقاء کو بیان کرنے میں مذکورہ شعبہ جات کے اہل علم نے خدا کے تصور اور مذہب کو انسانی خوف کی خود ساختہ اختراع قرار دیا ہے، اور حیرت انگیز طور پر اس اپروچ کو کسی مذہب دشمنی کے سبب نہیں بلکہ "ثابت شدہ" علمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

. ہمارے نزدیک اسلام سمیت ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے کہ وہ ہر شعبۂ علم میں الحادی نظریات کے ابطال کے لیے متبادل ٹھوس علمی بیانیہ مرتب کریں جس کا علمی رد اہل الحاد کے لیے ممکن نہ ہو اور دنیا اس علمی کام پر اعتماد بھی کرے۔ اس حوالے سے ضروری ہے کہ ہم اہل مشرق الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے ایک بند ھ قائم کریں۔ وجودِ باری تعالیٰ کے حوالے سے جدید ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے جواب دیے جائیں اور ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ہر خاص و عام کے لیے یکساں مفید ہو۔ ماضی میں اس حوالے سے مولانا اشرف علی تھانوی، اور عصرِ حاضر میں مولانا وحید الدین خان صاحب کا کام انتہائی اہمیت کا حامل ہے، جبکہ اس فکری یلغار کے خلاف اجتماعی حکمت عملی کے بارے میں مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب نے بھی کئی کتب لکھی ہیں جن کا مطالعہ افادے سے خالی نہیں۔ ہم نے

بھی بطور طالب علم اس علمی سلسلے کو موجودہ تقاضوں کے پیش نظر آگے بڑھانے کی سعی کی ہے۔ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت تھی جس میں انتہائی آسان انداز میں خدا اور مذہب سے متعلق عمومی سوالات کا جواب ہو۔

ساتھ ہی اس کتاب میں منطق اور سائنس کے ساتھ کامن سنس یعنی عقل کے بدیہی اصولوں سے خدا کا اثبات ہو اور ساتھ ہی الحاد کے حوالے سے علمائے کرام، داعیانِ اسلام اور عوام الناس کی ذمہ داری کا بھی تعین کیا جائے۔کتاب کے محققین اور اکیڈمکس نہیں بلکہ عام لوگ ہیں جو کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار ہیں یا علوم دینیہ کے وہ طلبا جو اس موضوع کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل پر ہم اپنے والدین، اہل وعیال اور ادارہ تحقیقاتِ مذاہب کے تمام معزز ممبران اور اپنے اساتذہ کے شکر گزار ہیں جنھوں نے علمی سفر کے ہر مرحلے میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا اور اپنی قیمتی تجاویز سے بھی نوازا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے۔آمین

سید اسرار احمد بخاری

کراچی

حصہ: اوّل
تاریخ

الحاد کا تعارف

دنیائے مذاہب میں بنیادی طور پر دو قسم کے عقائد سبھی کے ہاں کچھ اختلافات کے ساتھ یکساں طور پر موجود ہیں: وجود خداوندی اور فرستادگانِ خدا کا تصور جسے پیغمبر، تیر تھنکر، بدھ، اوتار اور دیگر ناموں سے جانا جاتا ہے۔ یہ دو عقائد تقریباً سبھی مذاہب میں موجود ہیں۔ ان دونوں عقیدوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور تخلیق کرنے کے بعد وہ اس کائنات سے لاتعلق نہیں ہوا بلکہ اس کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور اس کی مسلسل نگرانی سے روگردانی نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ اس نے انسانوں کو اچھے اور برے کی تمیز کا شعور ایک حاسہء اخلاقی کی صورت اس کے نفس میں ودیعت کر دیا ہے جسے فطرت کہتے ہیں۔ مزید برآں خدا کی طرف سے چند عملی نمونے بھی ایسے آئے جن کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی گزارنا چاہئے۔ چند ایک مذاہب کو چھوڑ کر سبھی اہم مذاہب میں آخرت کا تصور بھی ہے جس کے مطابق اچھے اعمال کرنے والوں کے لیے جنت اور برے اعمال کرنے والوں کے دوزخ ہے۔

مذہب کے متعلق ان عمومی عقائد کے خلاف ایک اور طرزِ فکر رائج رہا ہے جسے الحاد یا عمومی طور پر لادینیت کہا جاتا ہے۔ الحاد در حقیقت کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر کا نام ہے جو خدا پر عدم یقین سے تعلق رکھتا ہے۔ الحاد کے قائل یعنی خدا اور مذہب پر یقین نہ رکھنے والوں کو ملحد کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا، دیوتا یا مافوق

الفطرت ہستیوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لہٰذا مذہب بھی کوئی الہامی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ انسان کی اپنی سوچ و فکر کا نتیجہ اور اس کے ذہن کی اختراع ہے۔

الحاد Atheism

It (Atheism) is the belief that there is no God or gods.[1]

Atheism سے مراد کسی بھی صورت میں ایک قادر مطلق ہستی کا مطلقاً انکار کرنا ہے چاہے وہ ایک واحد ہستی کی صورت میں مانا جائے یا متعدد دیوتاؤں کی صورت میں۔ اس نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کو Atheist یعنی ملحد کہا جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں الحاد کی تین بڑی قسمیں ہیں جنھیں مروجہ اصطلاحات میں Agnosticism، Deism، اور Gnosticism کہا جاتا ہے۔

الحادِ مطلق (Gnosticism)

Gnosticism سے مراد معرفت یا علم رکھنا ہے۔ یہ ملحدین خدا کے انکار کے معاملے میں شدت کا رویہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ روح، دیوتا، فرشتے، جنت و دوزخ اور مذہب سے متعلقہ روحانی امور اور مابعد الطبعیاتی (Meta-physical) امور کو کسی بھی صورت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہیں کہ

[1] Julian Baggini, Atheism: **A Very Short Introduction,** (Oxford University press, 2003) P-3 (www.lightforcenetwork.com)

انسان اور کائنات کی تخلیق میں کسی خالق کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ خود بخود وجود میں آئی ہے اور فطری قوانین (Laws of nature) کے تحت چل رہی ہے۔اس نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کو Gnostic Atheist کہا جاتا ہے۔عام طور پر جب ملحدین یعنی اتھیسٹ کا ذکر ہوتا ہے تو ملحدین سے مراد یہی طبقہ ہوتا ہے۔

لاادریت(Agnosticism)

عام معنوں میں اس سے مراد خدا کو اپنے ادراک (سوچ، سمجھ) سے ماوراء سمجھ کر اس معاملے میں سکوت کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ خدا ہے یا نہیں، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اس بارے میں صرف یہ سوچنا چاہیے کہ "ہمیں معلوم نہیں ہے۔"ان لوگوں کو Agnostic Atheist کہا جاتا ہے۔اس عقیدے کے ماننے والے لوگ خدا کے انکار و اقرار دونوں سے دور رہتے ہیں۔

ڈیزم (Deism)

یہ نظریہ خدا کو صرف ایک خالق کائنات کی حد تک ماننے کا اصرار کرتا ہے۔ اس نظریے کے قائل لوگوں کے مطابق خدا کائنات کو وجود میں لا کر اور اس کے لیے مقررہ قوانین بنا کر خود کو معطل کر چکا ہے لہٰذا نظام کائنات میں اب کسی ہستی کی مداخلت نہیں ہے اور اس کائنات کا اب کوئی ناظم نہیں ہے۔ یہ عقیدہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے آٹو میٹک گھڑی بنادی اور اب وہ گھڑی از خود چلتی رہتی ہے۔

موجودہ الحاد کی تاریخ

خدا کے انکار کا یہ رجحان نیا نہیں ہے بلکہ ماضی کے ادوار میں بھی ہمیں بعض لوگوں کے ہاں یہ خیال ملتا ہے، زمانۂ قدیم سے ہی بعض لوگ کسی نہ کسی درجے پہ الحاد کے قائل تھے لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا مطلق انکار بہت ہی کم کیا گیا۔ بڑے مذاہب میں بدھ مت کے ہاں خدا کا کوئی واضح تصور نہیں پایا جاتا، تاہم دیوتاؤں پر بدھ مذہب کے ماننے والے بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے خدا کا انکار کیا۔ بعض نے اسے مختلف صورتوں میں تسلیم کیا ہے لیکن اس کی حیثیت صرف خالق کی مانی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں خدا پر عدم یقین کا رجحان محض ذاتی خیال پر مبنی تھا اس میں سائنسی و تکنیکی وجوہات شامل نہ تھی، لیکن جدید دور میں اس طرزِ فکر نے ایک منظم حیثیت حاصل کرلی ہے اور موجودہ الحاد سائنس اور علمیات (Epistomology) پر مبنی ہے۔

الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا جب دنیا کی غالب اقوام مثلاً یورپ و امریکہ نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کرلیا اور اپنے تمام معالات سے مذہب کو بے دخل کردیا۔ موجودہ الحاد کی تحریک کی تاریخ ہم سولہویں صدی کے اختتام سے شروع کرسکتے ہیں۔ یورپ میں قرون وسطی میں کلیسا کے مظالم کے خلاف تحریکیں اٹھیں

اور عیسائیت میں ایک نئے فرقے پروٹسٹنٹ کا ظہور ہوا۔ ان دونوں فرقوں میں کئی بار باہمی خانہ جنگی ہوئی، جب کوئی پروٹسٹنٹ حکمران ہوتا تو وہ کیتھولک پر مظالم کرتا اور جب حکمراں کیتھولک ہوتا تو پروٹسٹنٹ پر مظالم کرتا۔ یہ صورت حال عوام کے لیے مذہب سے بیزاری کا ایک اہم سبب بنی۔

اس کے ساتھ ہی اس دور میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا عمل شروع ہوا اور تعلیم تیزی سے پھیلنے لگی۔ نشاۃ ثانیہ سے قبل یورپ میں سب سے اونچا درجہ دینیات کا ہوتا تھا اور دینیاتی فریم ورک کی ہی روشنی میں ہر مسئلے کو دیکھا جاتا تھا، مگر چودھویں صدی کے بعد یہ صورت حال اس کے برعکس ہو چکی تھی۔ اب دینیات ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور یونانی اور دیگر عقلی کو ہی اصلاً معیار قرار دیا گیا۔ فلسفی اور سائنس دان اس بات پر مصر تھے کہ مقدس صحائف کو عقلی علوم کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ اہل علم کا یہ منہج مذہبی رہنماؤں کے لیے قابل تشویش تھا۔ چنانچہ انھوں نے سائنس کی نئی دریافتوں بالخصوص کائنات کے متعلق ان سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریات کے متعلق متشددانہ رویہ اختیار کیا۔ گلیلیو کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اعلان کرے کہ سورج زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اطالوی فلسفی اور ماہر طبعیات جیور دانو برونو (1548-1600CE) پر بھی الحاد کے الزام میں مذہبی عدالت کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا کچھ عرصے کی قید بامشقت کے بعد معافی مانگنے سے انکار کیا تو زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح دیگر ماہرین فلکیات اور طبیعیات کو بائبل کے خلاف ان کے سائنسی نظریات کی بناء پر سزائے

موت دی گئیں جن میں نکولس کوپر نیکس(1473-1543CE)جیور جیس اگریکولا (1494-1555)جیسے جید سائنس دان شامل تھے۔

سائنسی علوم کے علمبرداروں نے جب عیسائیت کو منطقی اور عقلی میزان پر جانچنا چاہااور عیسائیت کے بعض عقائد پر تنقید کی تو یہ بات مذہبی طبقے کی جانب سے برداشت نہ کی گئی۔اس معاملے میں عیسائیت سے وابستہ یہ دونوں ہی فرقے شدت پسند تھے، مذہبی انتہاء پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مذہبی عقائد سے ذرا سا اختلاف بھی کرتا تو اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔پروٹسٹنٹ نے اگرچہ عیسائیت کو پوپ کی غلامی سے آزاد اور کئی مذہبی اصلاحات نافذ کر کے عیسائیت کو روشن خیالی کی طرف گامزن کیا تھا لیکن اس بات پر وہ بھی تحمل نہ کر سکتے تھے کہ بائبل کے بیانات کو کوئی عالم عقلی طور پر غلط ثابت کر دے۔کئی سائنسدانوں کو بائبل کے خلاف ان کے علمی نظریات کی بناء پر سزائے موت دی گئی۔ان سائنس دانوں پر مذہبی رہنماؤں کے تشدد اور عیسائیت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی باہمی خون ریزی کے نتیجے میں ناگزیر طور پر مذہب اور خدا کے متعلق بھی بہت سے لوگوں کی فکر متاثر ہوئی۔

کئی لوگ اس صورتحال کی وجہ سے مذہب سے بیزار ہو رہے تھے اور مذہب پر کھلی تنقید کر رہے تھے۔اس تنقید میں سب سے زیادہ حصہ اُس دور کے فلسفیوں نے لیا۔ ڈیکارٹ(Descartes 1596–1650) جو جدید فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اور مذہب میں تفریق پیدا کی۔اگرچہ وہ خدا کا قائل تھا لیکن وہ عقل

پرستی کو فروغ دینے کا زبردست حامی تھا۔ اٹھارہویں صدی میں مشہور امریکی فلسفی ٹامس پائین (1737-1809) نے اپنی کتاب The Age of Reason شائع کی جس میں انھوں نے اپنے خیال کے مطابق عیسائیت کی خرابیوں اور بائبل کی غیر منطقی باتوں کو واضح کرتے ہوئے ان پر شدید تنقید کی۔ اس کے بعد ملحد فلسفیوں کی جانب سے مذہب پر تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی زمانے میں مشہور فلسفی کانتے (1798-1857) نے ایک خاص فلسفہ پیش کیا جو کہ "پازیٹوازم (Positivism)" کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو قابل مشاہدہ اور قابل ثبوت ہیں اور بقیہ چیزوں کے وجود کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالی کی ذات قابل مشاہدہ نہیں، اس وجہ سے اس کا انکار کر دیا گیا۔ کانتے کا یہ فلسفہ دورِ جدید کے الحادی نظام کی اہم بنیاد بنی۔ مذہبی علماء اور سائنس دانوں کی یہ خانہ جنگی مذہب اور سائنس کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر رہی تھے۔ اس تشدد کی وجہ سے عقل پسند طبقے کے لیے مذہب اور اس سے وابستہ تمام امور قابل نفرت ہو چکے تھے۔ مذہب کے غیر ضروری عقائد، نفس کشی، عبادات اور دیگر تمام حدود سے وہ تنگ آ کر باہر آنے لگے۔

اب تک اہل مذہب یہ دلیل پیش کرتے آئے تھے کہ کائنات کا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا کوئی خالق موجود ہے لیکن انیسوی صدی میں چارلس ڈارون (1809–1882) نے نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ اس نظریے سے ملحد سائنس

دانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بے جان مخلوق سے خود بخود ایک جاندار خلیہ پیدا ہوا جو کہ لاکھوں سالوں میں ارتقا کے عمل سے گزر کر ابتدائی درجے کا جانور بنا اور پھر کروڑوں سالوں میں آہستہ آہستہ یہ مختلف جانوروں کی صورت اختیار کرتا ہوا انسان بن گیا۔ اس کے بعد ملحد لوگ علی الاعلان مذہب سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے اور بہت سے سائنس دان و فلسفی خدا کی مختلف توجیہات پیش کرنے لگے۔

اسی دوران Deism کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اب یہ کائنات خود بخود ہی چل رہی ہے اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم سمتھ (1790–1723) کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری رکھی اور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی مختلف شکلوں موجود رہی اور مذہب و سائنس کے درمیان جنگ جاری رہی۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس (1883– 1818) نے اشتراکیت کا نظام پیش کیا۔ اگرچہ یہ نظام معاش سے متعلق تھا لیکن اس کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ مذہب عوام کے استحصال کے لیے گھڑا گیا ہے۔ دیگر فلسفیوں کی طرح مارکس نے بھی مذہب پر کئی واضح تنقیدیں کیں لیکن ان کی تنقید کا محور بالخصوص یونانی فلسفی اور ان کا مذہب تھا۔ سائنس اور مذہب کے مابین اس جنگ میں سائنس کی جیت ہوئی اور علمی ترقی سے لوگوں پر یہ بالکل واضح ہو گیا کہ زمین کی پیدائش، نظام شمسی اور زمین کی ہیت کے بارے میں اہل مذہب کی آراء کس قدر غیر معقول ہیں، اس فکر کے رد عمل میں کلیسا کی طرف

سے جو انتہائی درجے کا جبر و تشدد کا اختیار کیا گیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم طبقے میں بالعموم انکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

اس زمانے میں ساری دنیا پر سیاسی اور معاشی اعتبار سے مغربیت کا راج تھا۔ وہ علوم جن کی بنیادی ماضی میں مشرق کی وادیوں میں رکھی، اب ان کی نشو نما مغرب میں اپنے ہی خطوط پر ہو رہی تھی اور صنعتی انقلاب بھی مغرب کے ہاتھوں ہی ہوا تھا۔ اس صورت حال میں اقوام عالم بالخصوص مشرقی ذہن کا مغرب سے مرعوب ہونا اور ان کے نظامِ زندگی کو آئیڈیلائز کرنا فطری تھا۔

بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات اور الحاد

انیسویں صدی کے آخر تک الحاد مغرب میں اپنی مضبوط جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اس دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنہوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی سیکولرازم سمیت الحاد اور اس سے متعلقہ نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا۔ مذہب کے نام پر ہونے والی جنگیں عوام کے ذہنوں پر مذہب کی انتہائی غلط تصویر پیش کر چکی تھیں۔ مختلف فلاسفرز اور سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریات کی بناء پر مذہب کی بنیادیں بظاہر کمزور نظر آ رہی تھیں حتیٰ کہ یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ اب انسانیت کو کسی "خدا" اور "مذہب" کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کے سبھی مسائل کا حل اس کی عقل دے سکتی ہے۔ اس دور میں ہونے والی ترقی کے سبب بظاہر یہ دعویٰ درست نظر آ رہا تھا لیکن

بیسویں صدی کے ہی نصف میں کئی ایسے علمی انکشافات ہوئے جنھوں نے وہ اکثر بنیادیں منہدم کر دیں جن پر ملحدین کے افکار قائم تھے۔

ملحدین یہ خیال کرتے تھے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اسی صدی میں بگ بینگ تھیوری نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ اس تھیوری کے مطابق کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھی جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نظریے کو ماننے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مان لیا جائے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا ابتداء میں ملحد سائنس دان اور مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو اس قدر تقویت دی کہ اسے ٹھکرانا ناممکن ہو گیا۔ وہ قدیم نظریات جو الحاد کی بنیاد بن چکے تھے، رفتہ رفتہ سائنسی ترقی اور کائنات کے متعلق نئے انکشافات کی وجہ سے رد ہو رہے تھے۔ اس صورتحال کی وجہ سے بالعموم عقل پسند سائنس دانوں میں خدا کو ماننے کی تحریک شروع ہوئی اور کئی بڑے سائنس دان اور فلسفیوں نے خدا کے وجود کو منطقی بنیادوں پر تسلیم کیا۔ کائنات کی ملحدانہ تعبیر کو سائنسی غلطی تسلیم کر لیا گیا لیکن اس کے باوجود ایک بڑی تعداد نے جو خدا کو ماننے کو تیار نہ تھی ڈیزم کو اختیار کیا۔ حتیٰ کہ اب بعض مفکرین جو خود کو کٹر ملحد ثابت کرتے ہیں، کسی نہ کسی سطح پر ڈیزم کی پناہ ضرور لیتے ہیں۔

اقوام عالم پر الحاد کے اثرات

اقوام عالم پر جب مغرب کا غلبہ ہوا تو دوسرے ممالک میں مغرب کی صنعتی اور سائنسی ترقی کے ساتھ یہ نظریہ بھی پہنچا۔ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت ہی اس طوفان کی زد میں آئی تھی، جبکہ یورپ سے باہر ایک ہی خطے میں مختلف مذاہب کے ماننے والے موجود تھے جن پر الحاد کی تحریک کا اثر مختلف انداز میں ہوا۔ مناسب ہو گا کہ بجائے علاقے کے مذہبی اعتبار سے یہ جائزہ لیں کہ کس قوم پر الحاد کا اثر کس طرح ہوا ہے۔

ہندو

ہندو حضرات عام طور پر روایت پسند اور فطری طور پر مذہب پسند واقع ہوئے ہیں ۔ ہندومت نے اپنے پیروکاروں کے ذہن کو صدیوں سے مطمئن کر رکھا تھا۔ اسلاف پرستی کا شدید جذبہ اور مذہبی عقائد کی بے جا آزادی کا تصور پہلے ہی موجود تھا اس لیے اس مذہب کو الحاد سے زیادہ خطرہ نہ تھا۔ ایک شخص خدا کا انکار کر کے بھی ہندو رہ سکتا تھا۔ ان کے ہاں کئی ناستک فرقے بھی خدا کے منکر تھے لیکن اس کے باوجود مذہبی کتاب، شخصیات، رسوم اور دیوتاؤں پر پختہ یقین کی وجہ سے ہندوؤں نے بھی الحاد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

ہزاروں برس سے چلتی ہوئی ہندوؤں کی تہذیب خالصتاً مذہب پر استوار ہے، لوگ چاہے مذہب اور خدا کی کتنی ہی گستاخی کر لیں، خود کو ہندو کہلوانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنی مذہبی شخصیات سے عقیدت رکھتے ہیں۔ عقلیت پسندی کی شدّت نہ ہونے اور تہذیب و تمدن میں مذہب کے گہرے اثرات نے الحاد کو یہاں کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ مغرب کی طرح خدا کے انکار مطلق اور مذہب بیزاری کی عمومی فضا پیدا نہیں ہو سکی اور لوگ خود کو مذہب سے کبھی دور نہیں لے گئے۔ البتہ ایک قابل لحاظ تعداد لبرل ازم کی طرف مائل ہوئی۔ ہندومت کو الحاد سے خطرہ نہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب میں اس قدر آزادی ہے کہ ایک شخص ملحد ہو کر بھی ہندو رہ سکتا تھا۔

بدھ مت اور دیگر مشرقی ایشیائی مذاہب

جنوبی ایشیاء سے آگے ہی مذاہب کی ایک اور بڑی روایت ایسی رہی ہے جس کا تعلق خاص مشرقی ایشیائی تہذیب سے رہا ہے۔ ان میں کنفیوشس ازم، بدھ مت اور تاؤازم شامل ہے۔ ان سبھی مذاہب میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذاہب پہلے ہی کسی حد تک الحاد کے ہم فکر نظام تھے۔ ان کے مذہب کا اثر پہلے ہی ان کی زندگی پر انتہائی سطحی طور پر تھا، خدا کا تصور بھی غیر واضح تھا اس لیے انھیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ گوتم بدھ، کنفیوشس اور تاؤ کو ایک قومی ہیرو تسلیم کر کے خود کا برملا ملحد کہہ دیا جائے۔ جدید دور میں سب سے زیادہ تعداد جو الحاد بالخصوص ڈیزم اور اگنوسٹک ازم کی

طرف مائل ہوئی وہ انھی سے تعلق رکھتی ہے۔ بالخصوص چین اور جاپان کی آبادی کا بیشتر حصہ خود کو بدھ مت، کنفیوشسزم اور طاؤازم سے منسوب کرتے ہوئے اگنوسٹک کہتا ہے۔

مسلم

دنیا بھر میں الحاد کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ سے ہی اسلام رہی ہے۔ مذہب اسلام کی سادگی اور عقلی بنیادوں کی وجہ سے اسلام کو ضرب پہنچانے کا خاص موقع کبھی نہیں مل سکا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مذہب بیزاری کے جو اسباب قرونِ وسطیٰ میں عیسائیت میں تھے، اسلام میں ایسی کوئی بات موجود نہیں تھی۔ کلیساء کے یونانی نظریات کو سائنس نے باطل ثابت کر کے عیسائیت سے اعتماد اٹھا دیا تھا۔ لیکن اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں تھے جس کی مخالفت سائنس کرے، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی الحاد کو مغرب میں جہاں عیسائیت اور یہودیت کا راج تھا، بہت سے پیروکار مل گئے لیکن مسلمانوں میں بہت کم پیروکار مل سکے۔ مسلمانوں میں الحاد کو جن لوگوں نے تسلیم کیا ہے ان میں زیادہ تر کا تعلق ایسے مغربی ممالک سے ہے جن کی اسلامی علوم تک رسائی مشکل رہی ہے اور ان میں سے اکثر کا تعلق کمیونسٹ پارٹیوں سے رہا ہے۔ تاہم مسلمانوں کا وہ اشرافیہ طبقہ جن کا مغرب سے تعامل رہا تھا، وہ لبرل ازم کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ حتیٰ کہ عرب کی اشرافیہ بھی الحاد کی لہر کا شکار ہوئی۔

انقلابِ فرانس کے بعد سیکولرازم اور کمیونزم نے ملحدوں کی تعداد لاکھوں سے کروڑوں تک پہنچادی تھی۔ لیکن اس کامیابی کے بعد بھی الحاد کا زور ابھی تک مخصوص خطوں میں تھا۔ مغربی خطے سے باہر صرف چین الحاد کی لپیٹ میں آیا کیونکہ یہاں کمیونزم کو بطور نظام حیات اپنا لیا گیا تھا، نیز ان کا مذہب بھی الحاد سے کسی حد تک قریب ہی تھا۔

الحاد، جدید دور میں

حالیہ دور میں بڑھنے والی مذہبی انتہاء پسندی اور لا محدود آزادی کے تصور کی وجہ سے دین کی مخالفت کے جذبات نے مغرب میں کافی شدت اختیار کرلی ہے۔ چونکہ سائنس کے نام پر قائم کی گئیں الحاد کی کئی فکری بنیادیں خود سائنس نے باطل ثابت کردی تھیں، اس لیے اب خدا کے انکارِ مطلق کی کوئی گنجائش نہیں رہی، لیکن مذہب سے ملحدین کی مخاصمت باقی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں کٹر الحاد کے مقابلے میں اگنوسٹک ازم اور ڈیزم کو زیادہ فروغ ملا۔

نیو اتھیزم

الحاد کے لیے دورِ جدید میں ایک نئی اصطلاح New Atheism بھی رائج العام ہے۔ اپنے مقصود و منشاء کے اعتبار سے یہ الحاد کی کوئی شاخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ علمی تحریک ہے جو بیسوی صدی میں مذہب کی مخالفت کے لیے بعض مغربی مصنفین نے شروع کی۔ ان مصنفین میں سے اکثر کا تعلق عیسائیت سے تھا لیکن وہ بعد میں الحاد کی طرف مائل ہوئے۔

دیگر ملحد مصنفین کے برعکس جنہوں نے تشکیک کو فروغ دیا، یہ مصنفین (New Atheist Writers) خاص طور پر مذہب کے متعلق مخالفانہ مزاج رکھتے ہیں جس کا مشاہدہ ان کی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ان مصنفین میں رچرڈ

ڈاکنز(b-1941)، ڈینیٹ (b-1942) سیم ہیرس (b-1967) اور کرسٹوفر ہیچنز (b-1949) شامل ہیں جن کی کتابیں عالمی سطح پر کافی مشہور مقبول ہوئیں ہیں۔اس کے علاوہ یہ مفکرین اپنے نقطۂ نظر کے فروغ کے لیے مختلف سیمینارز اور کانفرنسز بھی منعقد کرتے رہتے ہیں جس کی بدولت ان کے نقطۂ نظر کی عالمی سطح پر تشہیر جاری ہے۔

نیو اتھیزم تحریک میں خاص طور پر قابل ذکر نام رچرڈ ڈاکنز کا ہے جو کہ ایک سائنس دان ماہر حیاتیات بھی ہیں۔ مذہب و خدا کی شدت سے مخالف کے باوجود ان کا کہنا ہے کہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ "خدا کا وجود نہیں ہے"۔[2] رچرڈ ڈاکنز نے مسلم اور عیسائی علماء و محققین سے مناظرے بھی کیے ہیں جن میں روون ولیم (b-1950) اور حمزہ اینڈریاس ((b- 1980 کے ساتھ ان کے مناظرے مشہور اور قابل دید ہیں۔

اس تحریک میں مذہب کے متعلق تنقید کا ہدف عقیدۂ آخرت، فرشتے، معجزات اور وہی امور تھے جس کے متعلق ماضی میں بھی بعض ملحدین اعتراضات اٹھاتے رہے تھے۔

[2] http://www.dailymail.co.uk/news/article-2105834/Career-atheist-Richard-Dawkins-admits-fact-agnostic.html (11 Aug 2013)

ملحدین کے افکار

مذہب

مذہب کے انکار میں ملحدین کا نقطۂ نظر ہے کہ مذہب دراصل قدیم انسانوں کی ایجاد ہے جسے انھوں نے اپنے فہم سے بالاتر سوالوں کے جواب نہ ہونے پر ذہنی تسکین کے لیے وضع کر لیا تھا۔ لیکن اب سائنس کی ترقی نے انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جس سے وہ پہلے لاعلم تھا۔ مثلاً گزشتہ زمانوں کے لوگوں نے جب سورج کو ایک مخصوص وقت پر طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پس پردہ ایک عظیم الشان اور مافوق الفطرت ہستی کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ اسی طرح دیگر بہت سے سوالات جس کی بابت ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس کے متعلق انھوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ یہ اسی غیبی ہستی کا کارنامہ ہے۔ لیکن چونکہ اب ہم اس دور میں جی رہے ہیں جہاں ہمیں ان سب کے فطری اسباب معلوم ہو چکے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا زمین کے گرد گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں اس کا کریڈٹ کسی خدا یا دیوتا کو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کائنات کے دیگر فطری عوامل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بھی خدا کے بجائے اس کی توجیہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

عقیدۂ آخرت کے بارے میں ملحدین کا موقف ہے کہ موت واقع ہو جانے کے بعد انسان کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ مرنے سے پہلے ہم موت کے بعد کیا ہوتا، اور کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس لیے عقیدۂ آخرت کو تسلیم کرنا غیر ضروری ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ مذہبی عقائد کی کوئی ٹھوس قابل مشاہدہ دلیل نہیں ہوتی لہٰذا اسے اب ایک گزرے ہوئے زمانے کا قصہ سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور مذہبی عقائد کو تسلیم کرنا انسانی عقل کی شان کے خلاف ہے کیونکہ جن سوالات اور مسائل کے لیے خدا اور مذہب کا وجود تھا اب ہمارے پاس ان کے خالص ٹیکنکل اور منطقی جوابات موجود ہیں۔ ان ملحد فلاسفہ کا اصرار ہے کہ ایک عقل پسند شخص ایسی کسی بات پر ایمان نہ لائے جس کا مشاہدہ حواس خمسہ سے نہ ہو۔

نفسِ انسانی کے متعلق ملحدین کا نقطۂ نظر

اہل مذہب نفس انسانی سے متعلق امور کو روح سے جوڑتے ہیں، چونکہ روح کا کوئی مادی وجود نہیں ہے لہٰذا ملحدین روح کو نہیں مانتے۔ ملحدین کے نزدیک انسان کے نفس میں جو کچھ اس کی تمنائیں، جذبات، عقل وغیرہ سبھی صرف خلیوں (Cells) کے نظام اور خارجی دنیا کے ساتھ انسانی جسم کے تعلق کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دو پتھروں کو باہم رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

طرزِ حیات

خدا کے وجود کے انکار کے ساتھ ہی لازمی نتیجہ کے طور پر وحی اور آسمانی صحائف کی بھی کوئی حقیقت واہمیت ملحدین کے نزدیک باقی نہیں رہتی۔ اہل مذہب کے مطابق خدا تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے وحی نازل فرمائی تاکہ انسان ان احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ لیکن جب مذہب کا انکار کیا جارہا ہو تو پھر طرزِ حیات کے متعلق سوچ وفکر میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ملحدین طرزِ حیات کے متعلق عام طور پر سیکولرزم اور معاشیات میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے قائل ہیں۔

مطلق آزادی کا تصور

فرد کی بے لگام آزادی ملحد نظامِ فکر کا بنیادی خاصہ ہے۔ یعنی ایک فرد اپنی انفرادی زندگی میں ہر طرح سے مکمل آزاد ہونا چاہیے اور اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں بھی اس سے مذہب کا ظہور نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مذہب جو سماجی اصول وضوابط، عبادات اور اقدار کا جو ضابطہ فراہم کرتا ہے، ملحدین کے نزدیک یہ سب غیر ضروری اور عملی زندگی میں غیر حقیقی ہیں۔ چنانچہ انسان کو اپنی زندگی میں مذہبی قدغن مثلاً شراب نوشی، زنا، سود، برہنگی وغیرہ کی حرمت کا احترام اور ان کی پابندی نہیں کرنی چاہیے۔ اس مطلق آزادی کے تصور میں مذہب محض ایک ثقافتی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ایک شخص جس مذہب وسماج میں پیدا ہوگا، اس کی شادی بیاہ، تہوار، تجہیز وتدفین وغیرہ کے رسوم اسی مذہب کے مطابق ہو سکتے ہیں۔

معاشی نظام

معاشی نظام کے متعلق ملحدین دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے جس کی بنیاد سود ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ اشتراکیت کا قائل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اصرار ہے کہ ہر انسان کو تجارتی و صنعتی سرگرمیوں کے لیے قطعی آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ منافع کمانے کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرلے، منافع کے حصول کے لیے مذہبی قوانین کے تحت حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ نیز اس معاشی نظام میں سود، بیمہ، انٹرسٹ وغیرہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے برعکس اشتراکی نظام میں کوئی بھی کاروبار شخص کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہوتی ہے اور سبھی افراد حکومت کے ملازم ہوتے ہیں۔ اشتراکیت کی مختلف صورتیں موجودہ دور میں رائج ہیں۔

اباحیت اور جنسی آزادی

الحاد کے فروغ کے ساتھ ہی مغرب میں جنسی آزادی کا تصور بیدار ہوا۔ اکثر ملحدین کے مطابق کھانے پینے سونے کی طرح جنسی خواہشات کی تکمیل انسان کی فطری خواہش ہے اور لہٰذا اسے اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کرے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک زنا بالجبر ایک غلط کام ہے مگر دونوں فریقین کی رضامندی سے ہونے والے جنسی تعلق میں کوئی برائی نہیں۔

فری سیکس کے تصور کو سب سے پہلے اہل مغرب میں مشہور ملحد ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ (1856-1939) نے پیش کیا تھا۔ فرائڈ کے مطابق جس طرح انسان بھوک، پیاس وغیرہ جیسی خواہشات کو پورا نہ کرے تو بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر بھی انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات بالکل درست ہے کہ جنسی خواہش کی آسودگی نہ ہونا نفسیاتی امراض کا پیش خیمہ بن سکتی ہے لیکن جنسی تسکین کو ہی ذہنی سکون اور ترقی کا سبب قرار دینے کا تصور محل نظر ہے۔ یہی تصور اہل مغرب نے بخوشی قبول کیا اور مصنفین، فلسفی، موسیقار، شعراء، ڈرامہ نگار اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں نے اس تصور کے فروغ کے لیے اپنی اپنی کوششیں کیں۔ دور حاضر میں جب مغرب میں فلم انڈسٹری قائم ہوئی تو اس انڈسٹری نے بھی جنسی آزادی کے تصور کو پروان چڑھایا۔ ابتداء میں عمومی قسم کی فلموں کے ذریعے لوگوں کے جنسی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئیں لیکن جلد ہی باقاعدہ طور پر اس مقصد کی تکمیل کے لیے پورنو گرافی (Pornography) پر مبنی فلم انڈسٹری قائم کی گئی جس کا اہم مقصد اباحیت اور ننگے پن (Nudism) کا فروغ ہے۔ اس انڈسٹری میں کام کرنے والوں کو مغرب میں عصمت فروشوں کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ محض ایک فلمی پیشے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماضی میں خواتین میں فری سیکس تحریک کے فروغ میں ایک اہم رکاوٹ جنسی تعلق سے حاملہ ہونے کا خوف تھا لیکن مانع حمل ادویات کی ایجاد نے اس تصور سے متاثر خواتین کو اس میدان میں آگے بڑھنے کا موقع دیا کہ وہ شادی کے بغیر جنسی تعلق سے بھی حاملہ نہ ہوں۔

بعد ازاں مغرب میں آزادانہ جنسی تعلق کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جس کے مطابق زنا بالجبر کے علاوہ انسان جس طرح جس سے چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کر سکتا ہے، اگر وہ ہم جنس پرستی کرے تو اس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا حق ہے۔ بیسویں صدی میں انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی بدولت اہل مشرق بھی اس جنسی بے راہ روی سے شدید متاثر ہوئے جس کا نتیجہ آج ہم بخوبی دیکھ رہے ہیں۔

حصہ دوم
اصول و مبادی

چونکہ ہم پوری کتاب میں خدا کے اثبات پر علمی گفتگو کریں گے اس لیے آغاز میں علمیات کے کچھ بنیادی اصول و مبادی کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ان بنیادی اصول و مبادی کو سمجھ لینے سے نہ صرف ہمیں استدلال کا طریقہ کار معلوم ہو گا بلکہ کئی ایسے مغالطوں سے بھی واقفیت حاصل ہو گی جس پر الحادی نظامِ فکر استوار ہے۔اس ابتدائی حصے میں ہم بنیادی اصول و مبادی مختصراً" مثالوں کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جس کی تفصیل مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب الانتباہ المفیدۃ میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس باب میں یہ اصول الانتباہ المفیدہ سے ہی ماخوذ ہیں۔

ماورائے ادراک اور خلاف عقل

عقلیات کے باب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہی مرحلے میں ہم دو باتوں کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ اوّل یہ کہ کوئی چیز ہمارے ادراک سے بلند ہو اور ہمیں سمجھ نہ آسکے۔ دوم یہ کہ کسی چیز کے نہ ہونے، یا باطل ہونے کا ہمیں یقینی علم ہو جائے۔ عام طور پر لوگ ان دونوں کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں جو ماورائے ادراک ہو، وہ خلافِ عقل بھی ہو گا۔ یہ مفروضہ کئی قسم کے مغالطوں کا باعث بنتا ہے۔

چونکہ انسانی عقل ایک محدود مادی فریم اور اپنے موجود علم کے تناظر میں چیزوں کا ادراک کرتی ہے اس لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ جو چیز ہماری فہم میں نہ آئے، اس کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا یا وہ خلافِ عقل ہی ہوں گی۔ آج کی جدید دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جس کی حقیقت انسانی فہم و ادراک پر واضح نہ ہونے کے باوجود اس پر یقین کیا جاتا ہے۔ جدید سائنس میں اس کی ایک مشہور مثال بلیک ہول (Black Hole) ہے۔

جدید سائنس کے مطابق جب کسی ستارے کی موت واقع ہوتی ہے تو ایک بلیک ہول بن جاتا ہے جہاں ٹائم اور اسپیس یعنی زمان و مکان کچھ بھی موثر نہیں

ہوتا۔ بالعموم ہمارے لیے اس حالت کو سوچنا بھی محال ہے کہ وقت اور مکان (Time & Space) موجود نہ ہو۔ مگر جدید سائنس دانوں کے نزدیک یہ ماورائے فہم و ادراک ہونے کے باوجود ایک انتہائی معقول بات ہے، سائنس میں ایسے کئی نظریات ہیں جنھیں ماورائے ادراک ہوتے ہوئے بھی حقیقت تسلیم کیا جاتا ہے۔

معیارِ قبولیت

کسی بھی دعوے یا مفروضے کو قبول کرنے کے لیے بنیادی طور پر دو اصول ہیں۔

- عقلاً ممکن ہو۔ یعنی اس کے نہ ہونے پر کوئی دلیل نہ ہو۔ نیز کسی عقلی لزوم کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً 2=1+1 ہونا لازم ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔
- دلیل عقلی یا نقلی اثبات کے لیے کافی ہو۔

یہ دو اصول دراصل وہ کامن سینس ہے جس کا استعمال ہم زندگی کے بے شمار معاملات میں بھی کرتے ہیں۔ جو بات عقلاً ممکن ہو، محال نہ ہو اور کوئی قوی دلیل اس کا اثبات کر رہی ہو، مثلاً یہ بات گو کہ خلافِ مشاہدہ ہے مگر عقلاً ممکن ہے کہ انسان روشنی کی رفتار سے سفر کر سکے، اس میں کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا عقیدہ یا دعویٰ اگر بیان کیا جاتا ہے تو اس کی دلیل کا جائزہ لیا جائے گا۔ اگر دلیل درست ہو تو خواہ ہمارے مشاہدے کے خلاف اور عقل سے ماوراہو، اس پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

یہی معاملہ ان حقائق کا بھی ہے جو مذہب بیان کرتا ہے۔ خدا کی ذات، پل صراط، جنت و دوزخ اور بہت سے معاملات یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امور دراصل خلافِ عقل نہیں بلکہ عقل سے ماوراہیں۔ یعنی ان چیزوں کو عقل سے ثابت ضرور کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی ہئیت کا ادراک مادی دنیا میں ناممکن ہونے کے سبب انہیں ماوراء عقل کہا جاتا ہے۔

غرض کہ مذہب کے بیشتر حقائق کو دلائل کی بنیاد پر ثابت کیا جاسکتا ہے، جس کی تفصیل متعلقہ مضامین میں آئے گی، سر دست یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب کوئی امر عقلاً ممکن ہو، اور دعویٰ کے اثبات میں قوی عقلی یا نقلی دلیل ہو یعنی خبر کے ماخذ جب اپنی استناد اور صحت کے اعتبار سے ثابت ہو جائیں تو پھر ان پر ایمان رکھنا منطقی اعتبار سے لازم ہے۔

ذرائع علم

عام طور پر ہمارے پاس خارجی دنیا سے کسی بھی چیز کے بارے میں علم کے تین ذرائع ہوتے ہیں۔ مشاہدہ، عقلی استدلال اور خبر۔ ان تینوں کی تفصیل اس طرح ہے:

حواس خمسہ

علم کا سب سے پہلا اور بنیادی ماخذ ہمارے حواس خمسہ ہیں۔ کوئی بھی مادی چیز جب ان حواس کو متاثر کرتی ہے تو ہمیں اس کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس بات کا علم ہم براہ راست اپنے مشاہدے (یعنی آنکھوں سے دیکھ کر) کر سکتے ہیں کہ سورج فی الواقع کوئی وجود رکھتا ہے۔ اسی طرح آگ، پانی، انسان، اور ہر ایک موجودات پر ہم ان حواس کی بدولت ہی یقین رکھتے ہیں۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں ان حواس سے صحیح علم حاصل نہیں ہو پاتا، مثلاً ہماری کسی بیماری کی حالت میں لمس، بصارت اور دیگر حواس کی کارکردگی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن عام حالات روزمرہ کی زندگی میں یہی حواس ہمارے لیے علم کا ماخذ ہوتے ہیں۔

عقلی استدلال

علم کا دوسرا اہم ذریعہ عقلی استدلال ہے جس میں ہم دلائل اور دستیاب علم (معلوم) کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اسے عام مثال سے یوں سمجھ لیجیے کہ جب ہم ساحل کی ریت پر کسی پاؤں کے نشان دیکھتے ہیں تو گو کوئی شخص ہمارے سامنے موجود نہ ہو، مگر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں سے کوئی گزرا تھا۔ دھوپ دیکھ کر آپ سورج کا یقین کر لیتے ہیں خواہ آپ سورج کو براہ راست نہ دیکھ رہے ہو۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ آپ ایک کمرے میں ایک کتاب کہیں رکھ کر جاتے ہیں، اور کچھ وقت بعد جب واپس آ کر دیکھتے ہیں تو کتاب کہیں اور رکھی ملتی ہے۔ آپ کا ذہن فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ اسے یقیناً کسی نے اٹھا کر یہاں رکھا ہو گا کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ کتاب خود سے اٹھ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ عام طور پر بہت سے امور جنھیں ہم براہ راست حواس سے نہیں سمجھ پاتے، اس کے بارے میں ہم قیاس، غور و فکر اور استنباط سے علم حاصل کرتے ہیں۔ سائنس کے اکثر و بیشتر مسئلے اسی طرح معلوم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کشش ثقل کوئی مادی شے نہیں ہے جسے کوئی شخص آپ کے سامنے کھڑا کر سکے۔ لیکن اس کے اثرات اس قدر واضح اور حقیقی ہیں کہ اس کا انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ Energy یعنی قوت کو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح اب سائنس بھی انرجی، اضافت، اور ویو میکانکس (Wave Mechanics) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور اور نظریات ہیں جو اسی طرح استنباط کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔

خبر

علم کا تیسرا ذریعہ ایسی خبر ہے جس کی استنادی حیثیت مشکوک نہ ہو۔ یہ ذریعہ گو علمیات (Epistemology) میں بنیادی حیثیت کا حامل نہیں ہے جس کی تفصیلی بحث فلسفے کی کتب میں Epistemology of Testimony میں دیکھی جاسکتی ہے تاہم سر دست یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض شرائط کے ساتھ جدید فلاسفرز کی اکثریت نے بھی اسے علم کے ماخذ میں شامل کیا ہے۔ خبر یا شہادت کی بنیاد پر معلومات لینے کا کام ہم عام زندگی میں بہت زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً عام لوگوں میں کسی نے نہیں دیکھا کہ خلیہ، فضا میں موجود گیس، بیماریاں، جراثیم، بیکٹریا وغیرہ کیا ہیں، لیکن ہم سائنس دانوں اور ماہرین پر اعتماد کرتے ہوئے ان پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بسرِ چشم نہیں دیکھا کہ زمین فی الواقع گول ہے، مگر ہم اس بات کو مانتے ہیں۔ آئین اسٹائن کی گواہی سے ہم بلیک ہول کے وجود کو بن دیکھے مان سکتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم ایک ڈاکٹر کے پاس بھی جاتے ہیں جو ہمیں ہمارے مرض کے بارے میں بتاتا ہے تو ہم اس پر یقین رکھتے ہیں اِلّا یہ کہ اس کی قابلیت ہمارے سامنے مشکوک ہو جائے۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جس میں ہم دوسروں کے علم اور ان کی اطلاع پر اعتماد کرتے ہیں بشرطیکہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔ مثلاً ہمیں کوئی یہ کہہ دے کہ کل رات تمہیں فلاں شخص نے زخمی کر دیا، حالانکہ ہم جانتے ہوں کہ ہمیں کسی نے زخمی نہیں کیا تو ایسی خبر پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

الغرض کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کو ماننے کے لیے ہمارے پاس تین ذرائع ہیں۔ حس و مشاہدہ، استدلال اور خبر صادق۔ کوئی بات ان میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو جائے تو اس کے لیے دوسرے ذرائع سے دلیل مانگنا غیر معقول رویہ ہے۔ کسی چیز کو ماننے کے لیے اصل بات یہی ہے کہ وہ ان تین ذرائع میں سے ایک سے ثابت ہو جائے۔

ثبوت اور نظیر

ایک عمومی مغالطہ بعض اذہان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی واقعے کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی نظیر موجود ہو۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ سمندر درمیان میں سے کھل کر راستہ بن گیا تو اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ایسا عمومی طور پر کبھی نہیں ہوا۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ اگر کوئی واقعہ محال نہ ہو، ممکن ہو تو پھر اس کی صداقت جانچ کر یقین کیا جا سکتا ہے خواہ اس کی کوئی نظیر موجود نہ ہو۔ کسی بھی فلسفہ و منطق میں یہ اصول کبھی بھی وضع نہیں کیا گیا کہ جس چیز کی مثال ہم نے نا دیکھی ہو، یا جو بھی چیز ہماری قدرت سے باہر ہو، وہ ناممکن ہے۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے محال ہونے پر قطعی دلیل نہ ہو، وہ ممکن رہتی ہے، بلکہ خبر کا ذریعہ (Source of Information) درست ہو۔

ضروری نہیں کہ وہی واقعہ سچ ہو جو پہلے بھی ہو چکا ہو، اگر یہ معیار مان لیا جائے تو پھر یہ عجیب اصول بن جاتا ہے کہ کسی بھی واقعے کے سچے ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ واقعہ دو مرتبہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول بالکل ہی غیر منطقی ہے۔چنگیز خان کے قتل عام کے ثبوت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں بھی کوئی چنگیز خان سامنے موجود ہو۔اسی طرح بہت سے واقعے ایک ہی مرتبہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس کی صداقت کے لیے اسے بار بار ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ کوئی دعویٰ سامنے آتا ہے تو امکان، عقل، خبر ان تینوں ذرائع کو ہی اہمیت دی جائے گی نہ کہ اس کی نظیر یعنی مثال کا مطالبہ کیا جائے گا۔

الحاد اور منطقی مغالطے

موجودہ دور میں الحادی فکر کے فروغ کے لیے جن ہتھکنڈوں کا استعمال کیا گیا ہے، ان میں ''استدلال'' اہم ترین عامل رہا ہے۔ خدا اور مذہب کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کے لیے ملحدین کی جانب ایسے مفروضے اور پھر ان پر مقدمات پیش کیے جاتے ہیں جو اپنی حقیقت میں سراسر باطل ہوتے ہیں مگر ظاہر میں ہمیں ''دلیل'' کی مات دیتے ہیں۔ ہماری لاعلمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے لوگ بالخصوص علم و دانش کے بعض نام نہاد علم بردار ہمیں کئی مغالطوں کا شکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ہم ایک غلط نظریے کو درست سمجھ لیتے ہیں بلکہ مخالفین کے لایعنی اعتراضات کو مضبوط اعتراض سمجھ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

الحاد فکر کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم منطق کا بنیادی علم رکھتے ہوں، بالخصوص منطقی مغالطوں کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔

خدا کے انکار کے لیے جن بالعموم دو طرح کے مغالطے دیے جاتے ہیں؛ جن کی تفصیل یوں ہے:

ا۔ دلیل لاعلمی (Argument from Ignorance)

- X غلط ثابت نہیں ہوا، اس لیے X درست ہے۔

یا

- X غلط ہے کیونکہ اسے سچ ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔

"Absence of evidence does not mean evidence of absence"

ثبوت کی غیر موجودگی کا مطلب غیر موجودگی کا ثبوت نہیں ہے۔

یہ بھی بہت ہی معروف مغالطہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات کا غلط ہونا یا اس کے برعکس کا درست ہونا ثابت نہیں ہوا اس لیے اس بات کی سچائی پر ایمان لے آیا جائے۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اپنے کسی دعوے کو درست ثابت کرنے کے بجائے اپنے حریف سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر میں غلط ہوں تو تم میرے دعوے کو غلط ثابت کر دو۔ اگر ان کا حریف ان کے دعوی کو غلط ثابت نہ کر سکے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا دعویٰ درست ثابت ہو گیا۔ حالانکہ ان کا استدلال غلط ہوتا ہے۔ کیونکہ کئی دفعہ کسی بات کے اثبات کے حق میں کافی و شافی دلائل نہیں ہوتے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ بات درست ثابت ہو گئی ہے۔ اسی طرح کوئی کہے کہ:

"دوسرے سیارے پر مخلوق موجود ہیں کیونکہ ان کے معدوم ہونے کا ثابت نہیں کیا گیا۔"

اسی مغالطے کی بنیاد پر ملحدین کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ:

"چونکہ خدا کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے، اس لیے خدا موجود نہیں۔"

منطقی اعتبار سے یہ دعویٰ مغالطے پر مبنی ہے اور علم نہ ہونے کی بنیاد پر ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ایسی صورتحال کا اصل حل اس بات کے اعتراف میں ہوتا ہے کہ اس نظریہ کے اثبات یا تردید میں کافی شواہد موجود نہیں البتہ اس کا **امکان** موجود ہے۔ نیز یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی بات کا ثبوت نہ ہونے کا محمول کون ہے؟ اگر آپ میدانِ طب (Medical Science) کے کسی مسئلے ثبوت طبعیات (Physics) سے چاہیں گے تو یہ خود مغالطہ ہوگا۔

2۔ توسل بالمرجعیۃ/دلیلِ احترام

- شخص A کا دعویٰ X ہے۔
- لہٰذا X درست ہے۔

توسل بالمرجعیۃ یا دلیلِ احترام ایسا مغالطہ ہوتا ہے جس میں معقول دلیل پیش کرنے کے بجائے اپنے مقدمے کے اثبات کے لیے کسی شخص، گروہ کو کتاب کو بطور اسناد پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس استدلال اور رویے کے رد میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (کتاب) کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی، تو وہ کہتے ہیں: نہیں ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے، اگر ان کے آباء واجداد نے نہ عقل سے کام لیا ہو اور نہ وہ ہدایت یافتہ (صحیح راہ پر) ہوں۔ (سورۃ البقرۃ۔ آیت 170)

اس مغالطے کی ایک مثال یہ استدلال دیکھیں:

"کائنات کا کوئی بھی خالق نہیں ہے۔ اتنے بڑے بڑے سائنس دان حتیٰ کہ دنیا کا ذہین ترین انسان رچرڈ ڈاکنس بھی یہی مانتا ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے اور کائنات از خود بنی ہے تو ہم کیوں خدا کو مانیں؟"

واضح رہے کہ اگر کوئی کسی کی استنادی حیثیت حرفِ آخر کے طور پر فریقین کے نزدیک مسلم ہو تو اس سے مراجعت مغالطہ نہیں ہوتا۔ لیکن کسی غیر متعلق شخص کو بطور سند پیش کیا جائے، مثلاً علم طب میں کسی ماہر قانون کی رائے پیش کی جائے تو یہ مغالطہ False Authority ہو گا۔

حصہ: سوم
خدا، مذہب اور سائنس

مذہب اور جدید سائنسی استدلال

سام ہیرس (Sam Harris 1976) امریکہ کے مشہور فلسفی اور مذہب کے ناقد ہیں جنھیں جدید الحاد کی نمائندہ شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ 2004 میں ان کی کتاب The End of Faith شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بنیادی مقدمات دو ہیں۔ اول مذہبی دہشتگردی تھا جو کہ فی الوقت ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے، جبکہ دوسرا مقدمہ مذہب کی عقلی حیثیت ہے۔ مصنف اور ان کے ہم خیال ملحدین کا ماننا ہے کہ مذہب محض اندھے اور بے دلیل عقائد کا مجموعہ ہے جو انسان کو محض لغو نظریات اور توہم پرستی ہی سکھاتا ہے جس کی کوئی عقلی حیثیت نہیں۔ سام ہیرس اس مقدمے کو اپنی مذکورہ کتاب کے ایک اقتباس میں یوں پیش کرتے ہیں۔

This has always posed a special problem for religion, because every religion preaches the truth of propositions for which it has no evidence. In fact, every religion preaches the truth of propositions for which no evidence is even conceivable. This put the "leap" in Kierkegaard's leap of faith.(The End of Faith P.23)[3]

عیسائیت کی تثلیث، یہودیوں کا نسلی تصور نجات، ہنود کی دیومالائی داستانیں، بدھ مت کے ماننے والوں کی خدا کے بغیر اخلاقیات کا پیکج، جین مت کی ارواح پرستی اور

[3] http://www.popeye-x.com/downloads/other/Sam.Harris.-.The.End.of.Faith.pdf

دیگر مذاہب میں، توہمات یقیناً اس نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے عام طور پر ان مذاہب سے بعض اساطیری روایات بھی پیش کی جاتی ہیں جو اس ضمن میں گو سب سے بڑا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مذہب بے دلیل ایمان وعقائد کا مجموعہ ہے، لیکن یہ معاملہ صرف انھی مذاہب تک ہی محدود رہنا چاہیے جو ایسی تعلیمات بیان کرتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو بغیر کسی تعصب کے یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دین عقل اور فطرت کی بنیاد پر قائم کردہ دلائل پر قائم ہے۔

قرآن مجید اپنی تمام تر دعوت تعصب یا جبر کی بنیاد پر نہیں بلکہ غور و فکر اور دلیل کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ سب سے پہلے اس کتاب کا غور و فکر سے تنقیدی مطالعہ کریں، اس کی ہر ایک بات قبول کرنے سے پہلے اسے عقل اور برہان کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور جب آپ کا قلب مطمئن ہو جائے تو اس وقت اس دعوت کو قبول کرنے میں کسی تعصب یا تامل کا اظہار نہ کریں۔ قرآن مجید کے جو مختلف نام قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان میں ایک نام برھان ہے۔ لفظ ''برھان'' دراصل عقلی اور استدلالی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔[4] قرآن میں اس کے نزول کا بنیادی مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان عقل و شعور سے کام لے کر بات کو سمجھے۔[5] قرآن مجید یہ اعلان کرتا ہے کہ:

---

[4] سورۃ الانفال۔ آیت 22

[5] سورہ یونس۔ آیت 2

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا

اے لوگو! بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک برھان آچکا ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح نور اتارا ہے۔(سورۃ النساء۔آیت 174)

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابَّ عِندَ اللّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لاَ يَعْقِلُونَ

یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔(سورۃ الانفال۔آیت 22)

ایک اور آیت میں قرآن عقل سے کام نہ لینے والوں کو بلا تخصیص جانوروں کے مترادف قرار دیتا ہے اسلام کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید میں بے دلیل بزرگوں کی اندھی تقلید پر بھی شدید تنقید کی گئی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (کتاب) کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی، تو وہ کہتے ہیں: نہیں ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے۔ اگر ان کے آباء واجداد نے نہ عقل سے کام لیا ہو اور ہدایت یافتہ وہ ہدایت یافتہ نہ ہوں تو؟۔(سورۃ البقرۃ۔آیت 170)

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا

(ایمان والے ایسے ہوتے ہیں کہ) جنہیں جب اُن کے رب کی آیات سنائی جاتی ہے تو وہاں پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرپڑتے (بلکہ غور و فکر بھی کرتے ہیں)۔(سورۃ الفرقان۔آیت 73)

قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بکثرت موجود ہیں جو یہ واضح کرتی ہیں کہ اسلام کی پوری بنیاد ہی عقل واستدلال پر قائم ہے۔قرآن مجید ایمانیات کے ضمن میں دوسرے مذاہب کی نسبت عقل انسانی کی تسلی کے لئے زبردست دلائل پیش کرتا ہے اور سائنسی حقائق کی طرح ہر لحاظ سے قابل آزمائش (Testable) ہیں اور ہم خود اس کا عقلی تجزیہ کر سکتے ہیں۔

اسلام کا وہ پہلو جس کا تعلق رسم ورواج اور معیشت و معاشرت سے ہے۔اس پہلو میں بھی اسلام اپنے احکامات کے ساتھ اس کے اسرار ورموز سے آگاہ کرتا ہے۔جس طرح دیگر سوشل سائنسز کا تجزیہ کیا جاتا ہے اسی طرح اسلام کے ان احکامات کا بھی معروضی انداز میں عقلی تجزیہ (Rational analysis) کیا جاسکتا ہے۔مثلاً اسلام معیشت کے بارے میں جو اصول فراہم کرتا ہے آپ اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں، اسلام کے معاشرتی قوانین ہی میں انسانیت کی فلاح ہے،اس دعوے کو بھی آپ اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں بلکہ فی زمانہ انسان نے جب بھی اسلامی اصولوں کے مقابل کوئی نظام کھڑا کیا ہے وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی واضح ہو گیا کہ ان انسانی قوانین میں کتنے سقم

تھے۔ لہذا اسلام کا دعویٰ اپنی جگہ برحق ہے کہ اس سے بہتر نظام نوعِ انسانی کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرف اسلام کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق ہماری محسوس دنیا کے بجائے مابعد الطبیعات (Meta physics) سے ہے۔ عام طور پر ناقدین کی طرف سے انھی امور سے متعلق بے دلیل ہونے کی بحث کی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کا وجود، قضاء و قدر، عبادت، الہام، حیات بعد الموت، جنت، دوزخ وغیرہ انھی مباحث میں شمار ہوتے ہیں جو ان مفکرین کے نزدیک ناقابل یقین امور ہیں۔ ان امور کے بے دلیل ہونے کا یہ خیال نیا نہیں بلکہ ماضی میں بھی یہ خیال عام رہا ہے جس کی بنیاد ماضی کا مقبول فلسفۂ علمیات منطقی تجربیت (Logical Empiricism) ہے۔ یعنی جو چیز حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، محسوس کرنے یا سونگھنے کے قابل نہیں ہوتی اسے خلافِ عقل قرار دے دیا جائے۔ اس نظریے کی رُو سے تمام علم کی بنیاد حسیات پر ہے۔ مذہبی عقائد و نظریات کی چونکہ کوئی واضح ٹھوس دلیل نہیں ہوتی 'نہ یہ ہمارے حواس کی زد میں آ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اس لیے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ماضی کے مشہور مغربی مفکر Edward H. Cotton بھی مذہب کے بارے میں یہی دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

Religion actually proves nothing; neitherdoes philosophy—in the sense in which men require proof to-day.Philosophy investigates and interprets.Religion professes and has faith. But neither gives to reason convictions which can withstand the

attacks of doubt and despair when the "lights are low and all the wheels of being slow."

"مذہب اور فلسفہ دونوں ہی اس لحاظ سے کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتے جس کا تقاضا دورِ حاضر کا انسان کرتا ہے۔ فلسفے کا کام محض تفتیش اور توضیح کرنا ہے اور مذہب کا بھی دعویٰ اور اپنا ایک نظریہ ہے لیکن دونوں ہی (اس ضمن میں) کوئی ایسی دلیل نہیں دیتے جو انسانی مایوسی اور شکوک کے مقابلہ کر سکے۔"

تجربیت کا فلسفہ اگرچہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے مگر 1920 کے بعد طبیعات میں ہونے والی تحقیقات مثلاً ایٹم کے وجود کو قبول کر کے اس فلسفے کو یکسر مسترد کر چکی ہے۔ آج کی طبعیات محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب سائنس بھی انرجی اور ویو میکانکس (Wave Mechanics) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور تسلیم کر کے اسی ایمان کے قفس میں ہے۔ لیکن یہ فلسفہ تجربہ گاہوں میں مسترد کیے جانے کے باوجود آج بھی بعض ناقدینِ مذہب کے اذہان پر غالب ہے اور وہ مذہبی عقائد کو ان ناقابل مشاہدہ اور حسیات سے ماوراہونے کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے۔

اسی مسترد شدہ فلسفے کی بدولت مخالفین مذہب دراصل طریقِ استدلال کو نہ سمجھنے کے غلطی میں مبتلاء ہیں۔ وہ مذہب کے ان غیبی امور کو بھی براہ راست (Direct Observation) سمجھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق استنباطی استدلال (Inference reasoning) سے ہے۔ مذہب کے ان امور کا تعلق چونکہ غیبیات سے ہے اس لیے

اس پہلو کا مطالعہ براہِ راست استدلال کے بجائے استنباط کے منطقی اصول سے اسی طرح مطالعہ کر کے تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اس اصول سے آج جدید سائنس کائنات سے متعلق ہونے والی تحقیقات میں ناقابل مشاہدہ امور کو معقول (Valid) سمجھتی ہے۔

غور کیا جائے تو مذہبی استدلال اور سائنسی استدلال دونوں ہی یکساں طریقے سے اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں۔ البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ چونکہ سائنس دانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ توانائی اور دیگر ناقابل مشاہدہ امور کو براہ راست کسی تجربی طریقے سے سمجھ سکیں، اس لیے ان کے بارے میں قائم ہونے والے تصورات میں ہمیشہ تشکیک کا پہلو موجود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ جبکہ مذہب اس معاملے میں پہلے درجے پر ہی منبع علم وحی (الہامی کتاب) کو امتحان سے گزار کر بغیر شک کے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس کے حاصل شدہ تصورات ہر کسی قسم کی تشکیک سے بالاتر رہے تاہم اس بات کی اجازت ہے کہ اسے بھی علم و دانش کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ سردست ہم اسی امر پر زور دیں گے اربابِ عقل سائنس کی طرح مذہب کے ناقابل مشاہدہ امور کا مطالعہ استنباط کے اصول سے سمجھ کر اور ان پر ایمان لائیں۔ قرآن مجید کی بھی یہی دعوت ہے کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، اُنھیں عقلی دلائل کی بنا پر مانا جائے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان بالغیب کہتے ہیں۔

مذہب اور سائنس کی قطعیت

Certainty in Science and Faith

فیتھ اینڈ ریزن (Faith and Reason) مانچسٹر کالج آکسفورڈ کا تحقیقی جرنل ہے جس کے شمارہ نمبر 134 (1992) میں ڈاکٹر پال بیدھم کا ایک مقالہ شایع ہوا۔ پروفیسر بیدھم مطالعاتِ مذاہب اور علم الٰہیات کے محقق ہیں۔ اپنے اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ایمان کو کبھی بھی سائنسی علم والی قطعیت کے درجے پر نہیں رکھا جاسکتا۔ ان کے الفاظ یوں تھے:

As a philosopher of religion, I feel compelled to acknowledge that faith could never be placed on the same level of certainty as scientific knowledge.[6]

ڈاکٹر بیدھم کے یہ الفاظ دراصل مذہب کے متعلق آج کے جدید ذہن میں پائے جانے والے خیال کے بھرپور عکاس ہیں۔ ماضی میں تجرباتی سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت بعض لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ جس طرح سائنس ہمیں حقائق سے

[6] بحوالہ: مولانا وحید الدین خان۔ فکرِ اسلامی۔ صفحہ 114۔

آگاہ کرتی ہے اور اپنے علم یعنی تصورات و نظریات کو تجربہ گاہ کے امتحان سے گزار کر حقیقت ثابت کرتی ہے مذہب اپنے تصورات کو اس طرح ثابت نہیں کرتے اس لیے مذہب اوہام جبکہ سائنس حقائق کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ ہم ایک بار پھر ڈاکٹر بید ھم کے الفاظ پر غور کریں تو ہمیں بنیادی طور پر دو دعویٰ (Arguments) نظر آتے ہیں۔

1- سائنسی علم قطعیت کے حامل ہوتے ہیں۔

2- مذہب کو سائنسی قطعیت کے درجے پر نہیں رکھا جا سکتا۔

یہاں سب سے پہلے ہمیں اس دعوے کو پرکھ لینا چاہیے کہ کیا واقعی سائنس سے حاصل شدہ نظریات اپنے اندر قطعیت رکھتے ہیں؟

ہم جانتے ہیں سائنس کی بنیاد مشاہدات اور تجربات سے حاصل کردہ معلومات پر ہوتی ہے جس میں بشری خامیوں اور کوتاہیوں کا امکان ہوتا ہے۔ سائنس کا نکتہ آغاز مفروضات (Hypothesis) پر ہے جو مشاہدہ اور تجربہ کے مختلف مراحل سے گزر کر سائنسی اعتبار سے معقولیت (Scientifically Valid) کے زُمرے میں آتا ہے۔ یہ معقولیت بھی قطعی ہونے کے بجائے درجۂ اِمکان (Degree of probability) کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنس چونکہ اِنسانی اِستعداد سے تشکیل پانے والا علم (Human Acquired Wisdom) ہے اس لیے اپنے میدان میں استنادی درجہ رکھنے کے باوجود یہ درجہ ایقان کو نہیں پہنچتا۔ سائنس اپنے بیشتر معاملات میں قائم شدہ

نظریات کو قولِ فیصل تصور نہیں کرتی بلکہ یہ نظریات حتمی قطعیت پر فائز ہونے کے بجائے ہر لحظہ مشکوک رہتے ہیں اور زمانے کے ساتھ اس کی غلطیاں بھی واضح ہوتی رہتی ہیں۔ کائنات کی عمر، روشنی کی رفتار، بلیک ہول، بگ بینگ کی تفصیلات جیسے کئی بنیادی نظریات ہیں جو تاحال تشکیک کے قفس میں ہیں اور مختلف تحقیقات و تجربات انھیں مشکوک بنا رہے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ سائنس دان ہمیشہ اپنی تحقیقات و استنباط کو قطعی اور مطلق و جامد (Absolute or Unchangeable) کے بجائے اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ موجودہ معلومات کی بنیاد پر یہ رائے یا توجیہہ زیادہ معقول ہے۔ سائنسی تصورات میں عدم قطعیت کا اقرار خود سائنس دان بھی کرتے آئے ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہی عدم قطعیت دراصل سائنسی علوم کے ارتقاء کا باعث ہے۔ فرانس کی Mediterranean یونیورسٹی میں فزکس کے محقق اور کئی کتابوں کے مصنف CarloRovelli سائنسی قطعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

Science is not about certainty. Science is about finding the most reliable way of thinking at the present level of knowledge. Science is extremely reliable; it's not certain. In fact, not only is it not certain, but it's the lack of certainty that grounds it. Scientific ideas are credible not because they are sure but because they're the ones that have survived all the possible past critiques.[7]

[7] www.newrepublic.com/article/118655/theoretical-phyisicist-explains-why-science-not-about-certainty+&cd=2&hl=en&ct=clnk&gl=pk

سائنس کا تعلق قطعیت سے نہیں ہے بلکہ دستیاب معلومات کی بنیاد پر نظریات کے قابل اعتماد ہونے سے ہے۔ سائنس یقیناً قابل اعتماد ہے لیکن قطعی نہیں ہے۔ بلکہ قطعیت سے محرومی ہی اس کی بنیاد ہے۔ سائنسی تصورات اس لیے قابل اعتماد نہیں ہیں کہ یہ یقینی و حتمی جواب دیتے ہیں بلکہ اس لیے قابل اعتماد ہیں کہ یہ تمام تر تنقیدوں کے باوجود عقلی اعتبار سے سلامت ہیں۔ یہی بات مغرب کے مشہور فلسفی کارل پاپر نے اپنی تصنیف ''سائنسی دریافت کی منطق'' میں اس طرح بیان کی۔

> ''ہمیں سائنس کو ایک ''مجموعۂ علم'' کی بجائے ''مفروضوں کے ایک نظام'' کے طور پر دیکھنا چاہئے، یعنی اندازوں یا توقعات کا ایک نظام جو اصولی طور پر تو قابل دفاع نہیں مگر ہم اسے اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ تجربے کی کسوٹی پر پورا اترتا رہے اور اس بارے میں ہم کبھی یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہمیں علم ہے کہ یہ ''سچ'' یا ''کم و بیش یقینی'' یا پھر ''احتمالی'' ہے۔[8]

اس موقع پر ایک مشہور سائنسی اصطلاح Scientifically Proven کی وضاحت بھی ضروری ہے جسے بالعموم حقیقت کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ سائنس کے ایک ادنیٰ طالب کو بھی اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ اس خاص اصطلاح سے مراد قطعیت کے بجائے کسی مفروضے کا سائنٹفک میتھڈ سے گزر کر معقولیت تسلیم کرنا ہے۔

[8]Karl Popper, The Logic of Scientific Discovery, Routledge Classics, 2nd Edition, 2002

یہ تسلیم شدہ تصورات، اصول و ضوابط اور دستیاب معلومات کی رو سے تسلی بخش اور درست ہو سکتے ہیں مگر انھیں صداقت کہنا، بلاجواز منطقی قطعیت کے درجے میں رکھ کر ''حقیقت مطلق'' ماننا اور پھر مذہب سے اس کا تقابل کرنا ایک بڑی فنی غلطی ہے۔ چنانچہ یہ بات سورج کی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ جس قطعیت کا مطالبہ مذہب سے کیا جاتا ہے خود سائنس بھی اپنے بے شمار نظریات میں اس قسم کی قطعیت سے محروم ہے۔

دوسری جانب مذہب (اسلام) کا موضوع انسان اور پوری کائنات کا نصب العین ہے۔ اس لیے مذہب اپنے باب میں سائنس کی طرح مشکوک قطعیت پیش نہیں کرتا بلکہ یقینی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ رہی یہ شرط کہ کسی چیز کو اُسی وقت تک قطعی مانا چاہیے جب تک مشاہدات اور تجربات اس پر معقول تنقید نہ کر دے، تو یہی بات قرآن بھی کہتا ہے کہ قرآن کی قطعیت کا ہر اعتبار سے امتحان لے لیا جائے اور اسے اطمینان کے بعد اسے قبول کیا جائے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ نہ اس منبع علم یعنی قرآن کی قطعیت کبھی بھی چیلنج کی جا سکی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی تنقید ہو سکی ہے جو اسے باطل ٹھہرا دے۔

''مذہب اور جدید استدلال'' کے تحت ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جس طرح دیگر امور کا عقلی تجزیہ (Rational analysis) کیا جا سکتا ہے اسی طرح مذہب کا بھی عقلی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی سائنسی نظریے کی قرآن کی قطعیت کا حال بھی اس کے عقلی

مطالعے کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے اس معاملے میں مطالعے کا ایک بہترین تنقیدی اصول خود قرآن نے مقرر کیا ہے۔ قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآن وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْد غَيْر اللَّه لَوَجَدُوا فِيهِ اِخْتِلَافًا كَثِيرًا

یعنی اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے (سورۃ النساء۔ آیت: 82)

اس اصول کی روشنی میں ہمیں قرآن مجید کی صداقت اور اس کی قطعیت کو جانچنے کا بہترین معیار ملتا ہے۔ قرآن کے بیان کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ انسان سے مخاطب ہو کر اسے کائنات پر غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ اس ضمن میں زمین و آسمان، تخلیق، انسانی جسم اور دیگر طبعی دنیا کے بارے میں بھی حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے۔ یہ موضوع، قرآن اور سائنس کے درمیان مشترک ہے۔ اس مشترک بنیاد کو لے کر ایک ناقد کو چاہیے کہ وہ قرآن مجید میں بیان کردہ حقائق کا علمی مسلمات (facts) سے تقابل کر کے دیکھے۔ یہ ثابت ہو گا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے علمی اعتبار سے قطعیت کی حامل ہے اور مسلمہ عقلی معیار پر ثابت ہو رہی ہے۔

سائنس اور انکارِ خدا

دی گرینڈ ڈیزائن(The Grand Design) اسٹیفن ہاکنگ کی تصنیف ہے جنھیں سائنس کی دنیا میں آئن سٹائن کے بعد سب سے ذہین اور ماہر ترین سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب 2010 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اسٹیفن ہاکنگ نے یہ دعوی کیا ہے کہ کائنات اور دنیا میں موجود حیات کی معرفت کے لیے ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قدرت کے قوانین Laws of Nature ہمیشہ سے ہیں اور وہ وہی اس گرینڈ ڈیزائن کی علت Cause ہیں۔ ہاکنگ اپنی اسی کتاب میں یہ الفاظ بھی کہتے ہیں:

Science makes God unnecessary

سائنس نے خدا کو غیر ضروری ثابت کر دیا ہے

سائنسی دریافت کی بنیاد پر بعض جید سائنس دانوں میں خدا کے انکار کا خیال انیسوی صدی کے بعد رائج ہوا ہے۔ نیوٹن کے بعد اس وقت یہ تاثر پیدا کیا جانے لگا کہ علومِ جدیدہ نے خدائی ایمان کی پوری عمارت کو مسمار کر دیا ہے۔ اس پوسٹ ماڈرن دنیا میں اب خدا کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ حتیٰ کہ مغرب میں خدا کی موت اور خدا کی تدفین جیسے نعرے بھی بلند ہونے لگے۔

ملحدین کے نقطہ نظر کے مطابق پہلے زمانوں میں انسان کا علم محدود تھا، اس وجہ سے اسے کائنات کی توجیہہ کا یہی تصور ملا کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں مان لیا جائے کہ اسے کوئی خدا چلا رہا ہے۔ لیکن سائنسدانوں نے ایسے قوانین دریافت کر لیے ہیں جن کی مدد سے یہ جانا جا سکتا ہے کہ یہ کائنات کیسے چل رہی ہے۔ اب ضرورت نہیں رہی کہ خدا کے تصور کے ساتھ جڑا جائے بلکہ ہمیں فطرت کے ان قوانین کا علم ہو چکا ہے جن کی مدد سے یہ کائنات چل رہی ہے۔ جیسے پہلے انسان سمجھتا تھا کہ سورج طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اس نے ایک خدا فرض کر لیا جو سورج کو نکالتا اور غروب کرتا ہے۔ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ سورج طلوع و غروب نہیں ہوتا بلکہ زمین گردش کرتے ہوئے اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس وجہ سے اب اس خدا کو بھی ماننے کی ضرورت نہیں رہی جو سورج کو کنٹرول کر رہا ہے۔ سائنس میں ہونے والی ہر ایک نئی پیش رفت دراصل اس تابوت کی ایک اور کیل ہے جس میں خدا کو بند کر دیا گیا ہے۔

اس نقطہ نظر کا جائزہ لینے سے قبل یہ غلط فہمی رفع کر لینا ضروری ہے کہ سائنس گو کہ آج بے پناہ ترقی کر چکی ہے لیکن سائنس نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا کہ پہلے جو تفصیلات معلوم تھیں، ان میں کچھ مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان معلومات میں اضافے کے نتیجے میں خدا کا تصور کسی طرح بھی بے کار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمیں کسی پراسیس کے بارے میں اضافی معلومات مل جائیں تو کیا اس سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ اس پراسیس کا کوئی خالق موجود نہیں ہے؟ ملحد سائنس دانوں کی غلطی یہ ہے کہ

وہ تخلیق اور "طریقۂ تخلیق" کو باہم مخلوط کر رہے ہیں۔ کسی شے کی طریقۂ تخلیق کا علم ہو جانا اس بات کا مجاز نہیں کہ اس شے کا خالق کوئی نہیں ہے۔ مولانا وحید الدین خان ملحدین کے اس خیال کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے، اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں، جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جس کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے۔ مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے، جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جا تے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعوی کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے، یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی

ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا؟ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے؟ اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے؟[9]

[9] وحید الدین خان۔ مذہب اور جدید چیلنج۔ ص 23-22۔ دہلی: مکتبہ الرسالہ۔ www.cpsglobal.org (ac. 13 Oct 2011)

نظریۂ ارتقا اور خدا

ارتقاء کا نظریہ حالانکہ قدیم زمانے سے لوگوں کے ذہنوں میں موجود رہا ہے، یونان کے کئی فلاسفر زارتقاء کے مکمل قائل تھے، لیکن انیسویں صدی سے پہلے یہ ایک گم نام سا نظریہ تھا جسے باقاعدہ طور پر مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ نیز اس میں الحاد کا کوئی خاص پہلو نہ تھا، لیکن مشہور ماہر حیاتیات سر چارلس ڈارون نے صدیوں سے چلے آرہے اس خیال کی مخالفت کی کہ انسان کو کامل صورت میں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اس نے انسان کی تخلیق کو ایک لگے بندھے قانون فطرت کے تحت ہونے والے ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا۔ ڈارون خدا پرست انسان تھا، اس نے اپنی ابتدائی تعلیم دینیات کے شعبے میں ہی حاصل کی تھی لیکن بعد میں اس میں تشکیک (Agnosticism) کے اثرات نمایاں ہوئے۔ ڈارون کے بعد ہونے والی مزید تحقیقات نے اس نظریے کو سائنس کی دنیا میں ایک مسلمہ اصول بنادیا اور اب یہ نظریہ بتاتا ہے کہ روئے زمین پر اربوں سال پہلے ساحل سمندر سے زندگی کی ابتداء ہوئی۔ پھر اس سے نباتات اور اس کی مختلف انواع وجود میں آئیں۔ پھر نباتات ہی سے ترقی کرتے کرتے حیوانات پیدا ہوئے۔ انہی حیوانات میں سے ایک بندر تھا، جس سے نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا موجودہ انسان کا وجود ہوا۔

اس نظریے کا سہارا لیتے ہوئے ملحدین نے یہ دعویٰ کیا کہ تخلیق انسانی کی توجیہہ اب بیان کر دی گئی ہے لہٰذا اب کسی خدا کو ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

ہماری نظر میں نظریہ ارتقا کو خدا کے وجود کے انکار کی اساس بنانا سوء فہم اور بڑی حد تک مذہب سے مخاصمت کا نتیجہ ہے کیونکہ اس بات سے خدا کے وجود یا عدم وجود پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کائنات اپنی موجودہ صورت میں ارتقا کا سفر طے کر کے پہنچی ہے یا اچانک پیدا ہوئی ہے، بلکہ یہ موضوع ہی مذہبی مباحث سے کلیتاً خارج ہے۔ البتہ مذہب اس بارے میں ضرور بحث کرتا ہے کہ کائنات جس طرح بھی تخلیق ہوئی، اپنی اصل میں یہ ایک خالق کی ہی مرہونِ منت ہے۔

جب تک ہم زمین پر پہلی زندگی کا درست تعین نہ کر لیں اس وقت تک ہمارے سامنے نظریۂ ارتقا کی بنیاد ہی نہیں بن پاتی ہے۔ سالمے کی صورت میں جو پہلی زندگی زمین پر ٹریس کی گئی اس کا میکینزم بھی اسی قدر پیچیدہ ہے جتنا آخری نوع کے انسان کی خلیاتی اکائی (Cell nucleus) کا میکینزم ہے۔ اس پہلی زندگی کے میکینزم کی اس قدر پیچیدگی یہ بتاتی ہے کہ ایسے مرکبات (Compounds) بننے میں اتفاقات کا عرصہ اربوں کھربوں سال پر بھی لگ جائے تو بھی ایک مثبت اتفاق ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر ایسا ہو گیا ہے تو یقیناً یہ معجزہ ہی ہوا ہے جو اتنے کم عرصے میں زمین پر پہلی زندگی کے آثار نظر آ گئے۔

دراصل ارتقاء کو مان کر خدا کا انکار کرنے والے جب تخلیق انسانی کی بات کرتے ہیں تو وہ سرچشمۂ حیات (Origin of life) کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ابتداء کے متعلق خود ہی پہلے سے ایک سالمہ (self-replicating molecule) کا وجود فرض کر لیتے ہیں اور پھر اسی پر پورے نظریۂ ارتقاء کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ حالانکہ اس نظریے کو مان کر سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ایک بے شعور اور بے حیات مادہ سے کس طرح ایک جاندار (Living thing) وجود میں آگیا؟ اور پھر خود مادہ بھی اپنے وجود کے لیے ایک خالق کا محتاج ہے از خود کہاں سے معرض وجود میں آیا؟

نظریۂ ارتقاء کسی طرح بھی پیش کر دیا جائے؛ یہ زندگی کی توجیہہ نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ یہ نظریہ خدا سے نہیں بلکہ اس کی تخلیقی اسکیم سے متعلق ہے۔ اگر کسی زمانے میں اس نظریے کے حق میں ٹھوس شواہد دستیاب ہو جائیں اور تجربہ گاہوں میں اس نظریے پر مہر ثبت ہو جائے تو بھی اس سے خدا کے عدم وجود کا کوئی علمی و سائنسی جواز نہیں ملتا۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ پہلے عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے الگ الگ نوع کی مخلوق پیدا کی اور اب یہ ہو جائے گا کہ خدا نے ایک ہی نوع سے زمین پر سارا تخلیقی عمل کیا۔ خدا کی ذات کو ان دونوں ہی نظریات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کیا خدا قوتِ محرکہ ہے؟

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ خدا کی کوئی ذات نہیں ہے بلکہ ایک قوت محرکہ Motive Force یا علت العلل Cause of Causes ہے، یا یہ کہ قوانین فطرت کا دوسرا نام خدا ہے، اس نقطہ نظر کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل ہم چاہیں گے کہ ہم اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات پر چار مختلف پہلوؤں سے غور کریں، وہ چار پہلو یہ ہیں،

1. حکمت
2. قدرت
3. ربوبیت
4. رحمت

پہلی چیز ہے حکمت۔ ایک صاحب عقل اور سلیم الفطرت شخص جب اس کائنات پر غور کرتا ہے تو جو چیز عقل انسانی کو سب سے زیادہ حیرت زدہ کرنے والی اور شعورِ آدم کو ورطہء حیرت میں ڈالنے والی ہے وہ اس کائنات کی چیزوں میں پنہاں حکمت ہے جو خاک کے حقیر ترین زرّے کے باطن سے لے کر کہکشاؤں کے پیچیدہ نظام تک کو محیط ہے، یعنی یہ کہ یہ آسمان و زمین ہمیں بے مصرف و بے مقصد نہیں لگتے۔ انسان کا شعور اور وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی نا کوئی مقصد ضرور ہے،

سائنسی تحقیقات روز افزوں اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ چیزوں میں موجود یہ بے مثل اور عمیق نظامِ حیات ایک دوسرے سے تسلسل کے ساتھ باہم مربوط اور اپنے عظیم تر مقصد کو پورا کرنے میں ہمہ تن جُتا ہوا ہے۔

دوسری چیز قدرت ہے، یعنی یہ کائنات، یہ کُرّہ زمین، اور طول و عرض میں پھیلی مخلوقات کسی برتر ہستی کی حکمرانی کے تحت ہیں، اور وہ برتر ذات مسلسل اپنی قدرت کے مظاہر ہمیں دکھاتی بھی ہے۔ سائنسی علوم میں ہونے والی تیز رفتار ترقی اور انسان کی علمی پیش قدمی ہر ہر قدم پر ایک عظیم ڈیزائنر اور لازوال خالق کی موجودی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

تیسری چیز ربوبیت ہے، یعنی اُس ذات نے کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر کو انسان کی پرورش کے لیے سرگرم کر رکھا ہے، خواہ وہ چاند و سورج ہوں، ہوا و پانی ہو، یا زمین کی سطح اور اسکی تہہ میں چھپی معدنیات، ہر چیز کسی بے غرض خادم کی طرح مسلسل انسان کی خدمت اور پرورش میں لگی ہوئی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ ہماری عقل کی بھی پرورش کا بہترین نظام یہاں موجود ہے، ہماری جسمانی قوتوں کی نشو نما ہر آن اور ہر گھڑی ہو رہی ہے، ہماری ذہنی اور روحانی تسکین کا سامان جابجا بکھرا پڑا ہے، ہمارے لطیف جذبات و احساسات کی بھی مسلسل خدمت ہو رہی ہے۔

چوتھی چیز رحمت ہے۔ انسانی زندگی اس رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے، آپ اپنے اطرف نظر دوڑا کر دیکھیے ہر زندہ وجود اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ہر جتن کرتا

ہے، دماغی بیماریوں کے استثناء کو چھوڑ کر دکھوں اور پریشانیوں کا مارا کوئی شخص بھی اپنی زندگی ختم نہیں کرنا چاہتا، حتیٰ کے مچھر اور چیونٹی جیسی چھوٹی اور حقیر مخلوق بھی اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے تگ ودو میں مصروف عمل ہیں۔

کائنات میں جاری و ساری حکمت، قدرت، ربوبیت اور رحمت کی توجیح کسی اندھے اور بہرے قانونِ فطرت کا نتیجہ نہیں ہوسکتی، ان مظاہر کی درست ترین توجیح کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ کائنات ایک رحیم و کریم، اور حکیم و داناء ہستی کے زیرِ نگیں ہے، جو تنہاء اس کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اپنی مخلوقات کی ہر آن خبر گیری کر رہا ہے اور ان سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہے، اگر قوانین فطرت کو خدا مان لیا جائے تو ایسا خدا ہمارے کسی کام کا نہیں جو مشینی قسم کا ہو، جو نا ہمارے دکھوں کا مداوا بن سکے، نا ہماری التجائیں اور فریاد سن سکے۔

ڈیزم اور تصور خدا

نوٹ: یہ تحریر حافظ محمد شارق کی کتاب ''سورۃ الفاتحہ: فلسفہ و مذاہب کے تناظر میں''، میں سورت کی پہلی آیت کی تفسیر سے نقل کی گئی ہے۔

سورہ الفاتحہ میں خدا تعالیٰ کے بارے میں وارد صفتِ ربوبیت خدا کے متعلق اس گھڑی ساز جیسے تصور کی بھی نفی کر دیتی ہے جسے عصر حاضر میں ڈیزم (Deism) کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے قائل لوگوں کے مطابق خدا کائنات کو وجود میں لا کر اور اس کے لیے مقررہ قوانین بنا کر خود کو معطل کر چکا ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر سے عیاں خدا کے خالق ہونے کو ڈیسٹ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ خدا ایک صاحب شعور ہستی ہے اور مختلف صفات سے متصف ہے، مگر تخلیق کے بعد اب نظام کائنات میں کسی ہستی کی مداخلت نہیں ہے اور اس کائنات کا اب کوئی ناظم نہیں ہے۔ یہ عقیدہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک ذہین شخص نے آٹومیٹک گھڑی بنادی اور اب وہ گھڑی از خود چلتی رہتی ہے۔ یہ فلسفہ ہمیں سولہویں صدی عیسوی کے بعد مغرب میں ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ Anthony Collins نے اس نقطہ نظر کو باقاعدہ فکری سند فراہم کی اور اس کے بعد بہت سے فلسفی اور سوچنے والے لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے۔ مشہور فرانسیسی فلسفی والٹیئر (Voltaire: 1694-1778) بھی اسی نظریے کا حامل تھا۔

والٹیئر کا ہم عصر اور اس کا فکری جانشین ہینری بولنگ بروک10(1751– 1678) نے ڈیزم کی درج ذیل خصوصیات بتائی ہیں:[11]

1. خدا کے پاس قوت اور مہارت ضرور ہے لیکن اس کی ذات ہر طرح کی اخلاقی صفات سے عاری ہے۔ وہ نہ ہی تقدس کا حامل ہے، نہ ہی انصاف پسندی، خیر یا اس کے مماثل کسی بھی قسم کی اخلاقی خوبیوں کا حامل نہیں ہے جو انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ خدا کے بارے اس نقل شدہ اخلاقی صفات کا تصور رکھنا دراصل مبالغہ آرائی اور خدا کی ہی توہین ہے۔
2. خدا نے یہ کائنات پیدا کی، اس کی شروعات میں قوانین فطرت بنائے، مگر اب وہ انسانی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر فرد کے معاملے کے بجائے مجموعی طور پر تعلق رکھتا ہے۔
3. روح انسانی جسم سے علیحدہ کوئی عنصر نہیں ہے۔ موت انسان کو مکمل طور پر تحلیل کر دیتی ہے (اور اس کا کوئی عنصر بھی باقی نہیں رہتا۔) سزا و جزا کا عقیدہ گو کہ انسانیت کے لیے مفید ہے لیکن اس کی اصلیت کسی فکشن سے زیادہ نہیں ہے۔

[10] Viscount Bolingbroke

[11] Shedd, William Greenough Thayer , A history of Christian doctrine Vol 1, T. & T. Clark, 1865

یہ تین نظریاتی ستون ہیں جن کی بنیاد پر ڈیزم کا فکری قصر قائم ہے۔ان تینوں تصورات کا حاصل یہی ہے کہ ربوبیتِ الٰہی، رسالت اور سزا و جزا کا تصور کوئی بھی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ خدا کے وجود کو اس فلسفیانہ فکر میں بھی شد و مد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس کے پیچھے بھی فکری محرک ہے۔

چونکہ آج سائنس اپنی کے ہر قدم میں غیر دانستہ طور پر خدا کے اثبات میں چار و ناچار دلائل فراہم کر رہی ہے، اس لیے خدا کا انکار ہر صاحبِ عقل کے لیے ایک غیر منطقی بات بن چکی ہے جبکہ مذہبی دنیا کی موجودہ صورت حال میں مانع ہے کہ خدا اور اس کے مذہب پر کلیتاً ایمان لایا جائے۔ لہٰذا ایک ناقابل تردید علمی حقیقت کے طور پر خدا پر ایمان رکھنے کا اصرار ڈیسٹ فلاسفرز بھی کرتے ہیں ، مگر مذہب سے روگرانی اختیار کرنے کا واحد ذریعہ یہی تصور ہے کہ خدا تخلیق کے بعد کائنات سے لاتعلق ہو چکا ہے ۔ بعض ڈیسٹ فلسفی خدا کو کائنات کا نگہبان بھی مان لیتے ہیں مگر انسان سے براہ راست کسی تعلق کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان خدا کی تخلیق ضرور ہے لیکن اس کا بندہ یا غلام نہیں۔ انسان کی زمینی زندگی میں آسمانی ہدایت کا کوئی حصہ نہیں ہے، وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ خدا کو بھی اس بات سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ وہ انسانی رشد و ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے یا انسان کو اس کے اعمال کی بنیاد پر سزا و جزا سے سرفراز کرے۔

غرض کہ ڈیزم کا فلسفہ سوائے واجب الوجود کو ماننے کے، مذہب کے تمام نظریات کا انکاری ہے۔ باوجود یہ کہ ڈیزم آج کے بعض تفکر پسند فلاسفرز کے ہاں ایک معقول نقطہ نظر سمجھا جانے لگا ہے، خالصتاً فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی اس میں کئی خامیاں موجود ہیں۔

۱۔ یہ خیال بالکل غیر منطقی ٹھہرتا ہے کہ خدا ایک انسانی کائنات (anthropic universe) کی تخلیق کرتا ہے جس میں وہ ساری کائنات اسی کی خدمت میں لگا دیتا ہے مگر وہ انسان کے بارے میں کسی بھی احساس سے عاری ہے۔ اگر وہ انسان سے کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھتا، اپنی اس عظیم الشان باشعور تخلیق سے محبت نہیں کرتا تو آخر کیوں اس نے انسان کے لیے تخلیقی ذہانت کا ایسا شاہکار بنایا ہے کہ ہر ایٹم، ہر خلیہ، کائنات کا پورا ماحول انسان دوست (Life supporting) ہے۔ نظامِ کائنات میں یہ تمام قوانین جس طرح زندگی کی بقا اور اس کی حمایت میں کھڑے ہیں، خود اس بات کی دلیل ہے کہ خدا انسانی زندگی سے محبت کرنے والی رحمن و رحیم ہستی ہے۔

۲۔ ڈیزم کا فلسفہ جس مسئلے کے ساتھ انتہائی گمبھیری سے دوچار ہوتا ہے وہ بشری اصول (Anthropoid Principle) ہے یعنی کائنات میں تمام طبیعی، کیمیائی، حیاتیاتی اور دیگر قوانین و مظاہر اس طرح توازن کے ساتھ موجود ہیں جیسا کہ انسانی زندگی کی بقا کے لیے لازم ہے۔ مثلاً بگ بینگ کی شدت، سورج اور زمین کا فاصلہ، کشش ثقل، ایٹم کی ساخت، کیمیائی عناصر، ان میں اگر معمولی سا بھی فرق ہوتا زمین پر انسانی زندگی کا کوئی

وجود نہ ہوتا۔ یہ حقائق بدیہی طور پر اس امر پر شاہد ہیں کہ اس کائنات کا خالق انسان سے محبت کرنے والا خدا ہے تبھی اس نے کائنات کا پورا نظام انتہائی کامل (Perfect) بنایا ہے۔ لیکن محبت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ تخلیق کے بعد مادی و وحانی ہر سطح پر انسانی کی نگہبانی کرے۔ اگر وہ کسی لمحے اس کائنات سے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ تو خدا کی ذات محبت کرنے والی ذات نہیں رہتی اور یہ بات بشری اصول کے خلاف ہے۔ ہم جانتے ہیں خدا کی ذات محبت اور رحم و کرم سے تعبیر ہے اس لیے اس کا تعلق دنیا سے ہونا بھی لازم ہے۔

۳۔ ڈیزم کا فلسفہ یہ بات تو تسلیم کر لیتا ہے کہ خدا خالق کی حیثیت سے وجود رکھتا ہے مگر وہ کائنات میں خدا کی مداخلت درست نہیں سمجھتا، اسی لیے وحی یا مذہب کے تمام تصورات کو غیر عقلی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ مذہب کے بغیر یہ سوال تشنہ رہ جاتا ہے کہ آخر خدا کو ایسی کائنات بنانے کی کیا سوجھی جس میں وہ کسی بھی درجے میں شریک نہ ہو؟ ڈیزم کو مان لینے کے بعد یہ نتیجہ کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات اُس صاحب شعور، مدبر خالق نے گویا "کوئی کھیل دیکھنے" کی خاطر تخلیق کی ہے؟

۴۔ ڈیزم کے فلسفہ بظاہر تو یہی تاثر دیتا ہے کہ اس سے کائنات میں جاری خیر و شر کا ذمہ دار خدا قرار نہیں پاتا، کیونکہ کائنات میں کسی بھی واقعے کا براہ راست ذمہ دار نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فلسفے میں خدا مذہبی خدا (Theistic God) سے زیادہ

بے رحم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسانی دنیا میں خیر و شر کا وجود ایک حقیقت ہے۔ مذہب اس کی مختلف توجیہات پیش کرتا ہے جس میں یہ قدر مشترک ہے کہ دنیا میں خیر و شر خدا کی جانب انسانیت کی حقیقی بھلائی کی غرض سے ہی ہے۔ جبکہ ڈیزم کو قبول کرتے ہی اگلے لمحے ہمیں یہی ماننا پڑتا ہے کہ خدا نے بلاوجہ ایسی کائنات بنادی ہے جو خیر و شر کا میدان بنی ہوئی ہے اور وہ خدا باوجود خالق و مالک اور قادر ہونے کے، کسی مداخلت کے بغیر محض تماشہ دیکھ رہا ہے۔ جبکہ مذہب خدا کو تماشہ بین کے بجائے ایک حکیم ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے جو ایک بے رحم ''تماشہ بین'' خدا سے زیادہ معقول ہے۔

خدا اور مذہب کی ضرورت

خُدا اور مذہب کا تصور فطرت انسانی کا جزو لاینفک اور لازمی حصہ ہے، خُدا کو پالینے کی طلب اور اُس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ اس قدر حقیقی اور انمٹ ہے کہ انسان عمر کے کسی حصے میں بھی اس سے آزاد نہیں ہو سکتا، انسان کی فطرت میں ایک خالق و مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اُس کے شعور کا لازمی جُزو ہے، "خُدا میرا خالق ہے اور میں اُس کا بندہ ہوں"۔ یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص روزِ اوّل سے ہی اس دنیا میں لے کر آتا ہے، ایک آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اُس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، جس کے بغیر وہ ایک عظیم خلاء اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

خُدا کو پالینا در حقیقت اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے، اور جو لوگ خُدا کو نہیں پاتے یا بزعم خود اُس کے وجود کا انکار کرتے ہیں وہ دوسری مصنوعی چیزوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، چنانچہ خُدا پر ایمان لانا خود فطرتِ انسانی کی پُکار ہے اور خُدا کا دین اُس پکار کا الہامی جواب ہے۔

فطرت انسانی میں نا صرف یہ کہ ایک خُدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے بلکہ نیکی و بدی، خیر و شر بھی وہ وبنیادی حقیقتیں ہیں جن کا شعور انسانی نفس میں

خُدائی الہام کی صورت موجود ہے، انسان چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، یا خواہ ملحد ہی کیوں نا ہو، وہ اس شعور سے عاری نہیں ہے کہ اس کے سامنے زندگی گزارنے کے دو واضح راستے موجود ہیں، ایک خیر کا رستہ ہے اور دوسرا شر کا راستہ، ایک سچائی کا راستہ ہے اور دوسرا جھوٹ کا راستہ۔

انسان اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے کہ اُس کے اندر ایک ایسی آواز ہے جو بتاتی ہے کہ سچائی کا راستہ ہی صحیح راستہ ہے، اور جھوٹ، دغابازی، دھوکہ دہی، خود غرضی، اور نفسانی خواہشات کو بے دریغ پورا کرنے کا راستہ صحیح راستہ نہیں ہے، انسان کے وجدان کی اسی آواز کو 'ضمیر' کہا جاتا ہے، ضمیر انسانی دُنیا میں خدا کی ایسی عدالت ہے جس کو اگر تھپک کر سُلا نا دیا گیا ہو تو اس کا ہر فیصلہ جانبِ حق ہی ہوتا ہے۔

دوسری طرف انسان کے اندر طاقتور نفسانی خواہشات بھی موجود ہیں جن کو پورا کرنے میں وقتی طور پر بڑی لذت محسوس ہوتی ہے، اور بعض اوقات یہ خواہشات کسی بے لگام جانور کی طرح انسان کے کنٹرول سے باہر ہونے لگتی ہیں، انہی نفسانی خواہشات کے زور پر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی پرواہ کیے بغیر وقتی لذت حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرے، دیکھا جائے تو انسان کی پوری زندگی اسی کشمکش سے عبارت ہے۔

اب اگر انسان یہ یقین کر لے کہ خُدا موجود ہے اور اس نے خیر و شر کا شعور دے کر انسان کو دنیا میں بھیجا ہے تو وہ ساری زندگی اپنے ضمیر کے کہنے پر چلے گا، اس کے

بالکل برعکس اگر وہ یہ مان لے کہ اس کے اوپر کوئی برتر ہستی حکمران نہیں ہے تو پھر انسان کچھ نہیں فقط مادے کا ڈھیر ہے، پھر ہر رشتہ، ہر اجتماعیت، ہر محبت، ہر قانون اور ضمیر کی آواز سب بے معنی چیزیں ہیں، پھر وقتی لذت ہی اصل حقیقت ہے جس کو پورا کرنے کے لیے ہر راستہ اختیار کرنا جائز ہے، ہر قانون توڑ دینا اس کا حق ہے۔ چنانچہ خدا پر ایمان کے بغیر انسان نفس کا بے لگام جانور ہے، جو اگر تسلیم کر لیا جائے تو انارکی اور انتشار دنیا کا مقدر ہے۔ کائنات کو ایک خالق کے بجائے محض حادثہ و اتفاق کا نتیجہ بتانا اس بات کے مترادف ہے کہ یہ کائنات اتفاقی ہے اور اس کے پیچھے کوئی قانون یا حقیقت نہیں ہے۔ یہ نظریہ ہماری عملی زندگی کو بھی شدید متاثر کرتا ہے۔ کیونکہ کائنات بے قانون ہے تو پھر اس کا ذرہ ذرہ اور اس میں بسنے والی ہر ایک مخلوق کو بھی کسی قسم کا پابند کرنا فطرت کے خلاف ہوگا۔ سیاست، معیشت، امن و امان ہر قسم کے قانون کا اطلاق کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کائنات کے ایک ابدی اصول کی مخالفت کر رہے ہیں۔

گویا خدا کو تسلیم کرنے یا نا کرنے پر انسان کے عملی رویّے کا انحصار ہے، صاحب ایمان ہونا ایک ذمہ دار انسان ہونے کے مترادف ہے، خُدا پر ایمان ہی وہ واحد چیز ہے جو انسانی زندگی کو با معنی اور با مقصد بناتی ہے، اس کے بعد انسان اپنی زندگی کا وہ برتر مقصد پالیتا ہے جس کی جانب وہ اطمینان سے بڑھ سکے، خُدا کے انکار کی صورت میں انسان انتشار اور مایوسی کے سوا کہیں نہیں پہنچتا۔

کیا سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟

یہ سوال کہ کیا سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟ منطقی طور پر ہی غلط ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ خدا کے وجود کا انکار سائنس کا دائرہ کار میں نہیں آتا ۔ سائنس کا دائرہ کار مادہ، توانائی اور ان کے طبعی قوانین تک محدود ہے، جب کہ خدا ان قوانین کا خالق ہے جو نہ ہی مادہ ہے اور نہ توانائی۔ سائنس تجربہ گاہوں سے نشو نما پاتی ہے جبکہ خدا کی ذات خدا کوئی مادی تصور نہیں ہے جسے تجربہ گاہوں میں ثابت کیا جاسکے۔ بلکہ یہ کام خالصتاً عقل واستدلال کا ہے اور خدا کی معرفت استدلال سے ہی ممکن ہے۔

دوسری وجہ سائنسی علم کی محدودیت ہے۔ اپنے محدود علم کی بنیاد پر سائنس کے لیے کسی کی عدم موجودگی کی گواہی دینا منطق کی روشنی میں ناقابل اعتبار ہے۔ زمین پر سفید کوّے کی معدومیت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے زمین کے ہر کون و مکان اور فضائی دنیا میں اس کی تلاش کریں اور اس پورے علم کے بعد آپ زمین پر سفید کوے کی معدومیت کا دعویٰ کریں۔ اسی طرح قطعی طور پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خدا نہیں ہے ، ہمارے لیے مادی و غیر مادی دنیا کا کلی علم (Infinite knowledge) ہونا لازم ہے۔ کوئی بھی شخص یا سائنس کی جانب سے خدا کے وجود کا انکار اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ عالم شہود اور عالم غیب ہر دو سے مکمل طور پر باخبر

ہو اور پھر اپنے اس کلی علم کی بنیاد پر وہ اس کا انکار کرے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ جبکہ انسانی عالم یعنی سائنس کی حالت یہ ہے کہ ہماری کہکشاں جو کائنات کے ایک انتہائی چھوٹے سے جزو کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بھی بہت سے سربستہ راز سے سائنس اب تک پردہ نہیں اٹھا سکی ہے۔ سائنس داں ہمیشہ سے یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ ابھی وہ کائنات کے بارے میں مکمل طور پر کچھ بھی نہیں جانتے۔ مشہور ملحد ماہر طبعیات برین کاکس (b.1968) کے بقول اس وقت سائنس 96% کائنات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔[12] تخلیق کائنات، انسانی ذہن اور مادہ سے لے کر بلیک ہول تک کائنات کے اپنے دامن میں ایسے راز سمیٹے ہوئے ہے جن کے بارے میں سائنس اب تک حتمی طور پر کچھ نہیں جانتی۔

اس وقت سائنس کی حالت گویا ساحل سمندر پر کھڑے اس شخص کی سی ہے جو سطح بحر اور اس سے اوپر فضا کر مشاہدہ کر رہا ہے لیکن پانی کی سطح کے نیچے بہت سی مخلوقات اس کے مشاہدے سے باہر ہے چنانچہ وہ اپنے حواس ظاہرہ سے ان کے وجود کا

[12] http://www.theguardian.com/theobserver/2010/mar/07/brian-cox-solar-system-interview

ثبوت نہیں دے سکتا مگر ان کے عدم وجود پر بھی کسی استدلال کا مستحق نہیں ہے۔اس موقع پر قرآن مجید کا یہ اعلان سامنے رکھنا چاہیے۔

أَمْ عِندَهُمُ ٱلْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ

کیااِن کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اُس کی بناپر یہ لکھ رہے ہوں؟

(سورہ قلم۔آیت 47)

خدا اور کائنات کی ازلیت

منکرینِ خُدا کا ایک بہت پرانا استدلال ہے کہ کائنات کو اگر کسی خالق کی تخلیق تسلیم کر لیا جائے تو لازما "ایک خالق کے وجود کو بھی ماننا پڑے گا اور از روئے منطق اسے ازلی تسلیم کرنا پڑے گا، اس مسئلے کا حل انہوں نے اپنے تئیں یہ نکالا کہ بجائے خالق کے کیوں نہ کائنات کو ازلی مان لیا جائے۔

جبکہ سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کائنات ازلی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک متعین ابتداء ہے، کائنات کی اب تک ایسی کوئی صفت علماء سائنس کے علمی زخیرے میں شامل نہیں ہو سکی ہے کہ جس کی بنیاد پر کائنات کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے، اگرچہ انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہری فریبِ حُسن موجود تھا لیکن حرکیات کے دوسرے قانون Law of Thermodynamics کے انکشاف کے بعد یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔ بعض ملحدین کے نزدیک قانون حرکیات کے مطابق انرجی نہ ہی پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ فنا کی جا سکتی ہے، اور چونکہ مادہ موجود ہے اس لیے یہ ازلی ہونا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کائنات کی تنظیم و ترتیب کو حکمت و شعور سے عاری بے جان مادہ سے نسبت دینے کے بجائے یہ زیادہ معقول نہیں کہ ایک صاحب و شعور ہستی نے اسے تخلیق کیا۔

سائنس کے ایک قانون ، قانونِ ناکارگی Law of Entropy کے مطابق قوت اور حرارت مسلسل خرچ ہوتی رہتی ہے اور اس کے سبب ایک پُر قوت وجود مسلسل ایک بے حرارت وجود میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یعنی اجزام سماوی سے مسلسل حرارت خارج ہو رہی ہے اور ایک وقت آئے گا کہ جب تمام اجسام بے قوت اور تاریک ہو کر رہ جائیں گے اور زندگی اپنا وجود کھودے گی۔

دورِ جدید کی سائنسی تحقیقات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے بلکہ ایک متعین وقت پر اور ایک متعین قوت کے ساتھ وجود میں آئی ہے، اور اب مسلسل اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔اسی جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی ماہر حیوانات ایڈورڈ لوتھر کیسل لکھتے ہیں:

"غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے، اور ایسا کرتے ہوئے اُس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ خود بخود شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً" وہ ایک محرکِ اول یعنی ایک خالق یا خُدا کی محتاج ہے۔(The Evidence of God p.51)

تخریب میں تعمیر

انیسویں صدی کے اوائل میں ''کائنات کی تخلیق'' کے متعلق سائنسی اور علمی حلقوں میں یہ تصور بہت مقبول اور عام تھا کہ کائنات لا متناہی وقت سے وجود رکھتی ہے۔ جس کی کوئی ابتداء نہیں۔ لا متناہی اور ہمیشہ سے موجود کائنات کا یہ تصور یورپ کے مادہ پرستانہ فلسفیوں کے خیالات سے ہم آہنگ تھا، چرچ اور مذہب کی شکست و ریخت کے بعد مغربی معاشرے میں فلسفیانہ خلاء کو پُر کرنے کے لیے مادہ پرستانہ خیالات و توجیہات کا سہارا لیا گیا جو در حقیقت قدیم یونان سے اخذ کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق مادہ ہی وہ واحد شے ہے جو کائنات میں وجود رکھتی ہے اور اس کا وجود لا متناہی وقت (ہمیشہ) سے ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر مادہ پرستی کا یہ دعویٰ بھی رہا کہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور اسے تخلیق نہیں کیا گیا۔ اپنے تمام تر ڈیزائن اور نظم و ضبط کے ساتھ یہ کائنات از خود وجود میں آگئی اور اس کا کوئی خالق نہیں۔ اپنے مذکورہ دعوے کے ساتھ مادہ پرست یہ بھی اخذ کرتے رہے کہ کائنات کی کوئی غرض و غایت اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ تمام توازن، نظم و ضبط اور ہم آہنگی جن کا مشاہدہ ہمیں ہر وقت اور ہر طرف ہوتا رہتا ہے محض اندھے اتفاقات کی پیداوار ہیں۔

تاہم بیسویں صدی کے سائنسی انکشافات نے مادہ پرستانہ خیالات اور تصورات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ جدید فلکیات کی تاریخ میں 1920 کا عشرہ بہت اہم تھا۔ 1922 میں

روسی طبیعیات دان الیگزینڈر فرائیڈ مین نے آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کی روشنی میں حساب لگا کر بتایا کہ کائنات کی ساخت ساکن یعنی غیر متغیر نہیں ہے اور اس کا ایک نقطہ آغاز تھا اور یہ ایک بڑے دھماکے کے نتیجے میں اسی طرح پھیل رہی ہے جیسے کسی نے اسے پھیلنے پر مجبور کیا ہو۔ 1929 میں امریکی سائنسدان ایڈون ہبل نے مشاہداتی شہادت کے ساتھ فرائیڈ مین کی تحقیقات کی تصدیق کی۔

بعد میں ہونے والی پے در پے تحقیقات نے ثابت کیا کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ساری کائنات اپنی زبردست کششِ ثقل کے باعث ایک نقطے پر جمع تھی جس کا حجم صفر تھا، ساری کائنات اسی صفر حجم اور لامتناہی کثافت والی کمیت کے پھیلنے سے وجود میں آئی، آج اسی عمل کو بگ بینگ (BigBang) کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی تصدیق بار بار کے مشاہدات سے ہو چکی ہے اور سائنس دانوں کے نزدیک یہ نظریہ تخلیق کائنات کے عمل کی انتہائی معقول توجیہہ ہے۔

بگ بینگ کے نظریے نے جہاں لامتناہی اور لافانی کائنات کے تصور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا وہیں لادین اور ملحد فلاسفہ کو بھی نہایت اہم سوالات سے دوچار کر دیا کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو ایک زبردست دھماکے سے کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کا سبب بنی؟ مادے میں شعور اور بالخصوص سیارہ زمین پر زندگی کو وجود دینے کے لیے موافق حالات کس ہستی نے پیدا کیے؟ یونیورسٹی آف ایڈلیڈ آسٹریلیا کے پروفیسر پال ڈیویز بگ بینگ کے متعلق کہتے ہیں:

The explosive vigor of the universe is thus matched with almost unbelievable accuracy to its gravitating power the big bang was not evidently, any old bang, but an explosion of exquisitely arranged magnitude.

''کائنات کی دھماکہ خیز طاقت (جو اس کے پھیلاؤ کا سبب بنی) اس کی ثقلی قوت سے کم و بیش ناقابل یقین حد تک درستگی کے ساتھ مماثلت رکھتی تھی. بگ بینگ کوئی معمولی نوعیت کا ابتدائی دھماکہ نہیں تھا بلکہ یہ غیر معمولی طور پر نپی تلی شدت کا دھماکہ تھا۔''

(Paul Davies, Super force: The Search for a Grand Unified Theory of Nature, 1984, p. 184)

پروفیسر پال مزید لکھتے ہیں:

The evidence is strong enough to acknowledge the existence of a conscious cosmic design.

''کائنات کے پھیلاؤ میں خالق کے وجود کی شہادت انتہائی مضبوط اور ناقابل تردید ہے، جس سے ثابت ہے کہ کائنات کو سوچ سمجھ کر تخلیق کیا گیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ''دھماکہ'' اصلا'' ایک تخریبی واقعہ ہے۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ کبھی کوئی دھماکہ تعمیری نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کائنات کی تاریخ میں صرف بگ بینگ ہی واحد استثناء ہے جس نے تخریب کے بجائے تعمیری نتائج پیدا کیے۔ جس کے بعد

کائنات اپنی تمام باریک ترین جزئیات سمیت نوعِ انسانی کے رہنے کے لیے ایک منظم اور مربوط نظام کی صورت وجود پذیر ہوئی۔

تخریب میں سے تعمیر برآمد کرنے کا یہ استثنائی واقعہ اس بات کا بیّن اور واضح ثبوت ہے کہ اسے ایک غالب و دانا ہستی نے برپاء کیا ہے، جو تخریب کو تعمیر میں، ''نہیں'' کو ''ہے'' ''میں'' اور ناممکن کو ممکن میں بدلنے پر قادر ہے۔ وہی اللہ ہے، جو چیزوں میں توازن، ہم آہنگی اور کامل نظم و ضبط پیدا کرتا ہے، چیزوں کو عدم سے وجود بخشتا ہے، وہی بتداء ہے وہی انتہاء ہے۔ نہ اس سے پہلے کچھ تھا نہ اس کے بعد کچھ ہو سکتا ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

کوئی بھی شخص اپنے اطراف میں موجود نظامِ قدرت کی نشانیوں کو بغور دیکھ کر اور ان کے گہرے مطالعے کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کائنات ایک بہترن مدبّر اور لازوال خالق کی بے مثال تخلیق ہے۔ دنیا کو ہم جس پہلو سے بھی غور و فکر اور تدبّر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ ہمیں وجودِ باری تعالیٰ اور اس کی اعلیٰ ترین قوت و اختیار کی گواہی دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر صرف وہی لوگ اللہ کی ان نشانیوں کو سمجھ سکتے ہیں جو دیدہءبینا اور عقیل سلیم رکھتے ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کے لیے سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی بخشتا

ہے، اور زمین میں ہر قسم کی مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور آسمان و زمین کے درمیان تابع رکھے گئے بادلوں میں، عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ البقرہ: آیت 164)

کیا کائنات اتفاقی حادثہ ہے؟

الحادی نظام فکر کی رُو سے تمام کائنات کا مبداء اوّل اور اساسی عنصر مادہ ہے جس کے علاوہ کوئی شے حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ یہ پوری کائنات ایک مقدم مادے کے اتفاقی ارتقا کا نتیجہ ہے جو ترقی وتدریج کے عمل سے گزر کر اپنی موجودہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے پسِ پشت نہ ہی کوئی خالق، ناظم یا مربی ہے جسے اہل مذہب خدا کہتے ہیں۔

اگر یہ اقرار کیا جائے کہ اس کائنات کے پس منظر میں کوئی مربی اور باشعور ہستی کی منصوبہ بندی کارفرما نہیں ہے تو ہمیں لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ سارا نظام کائنات محض ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ لیکن سائنس و منطق کی دنیا میں اتفاق کی کوئی عمومی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی منظم حسابی نظریہ (Law of Probability) ہے جس کا اطلاق ایسے امور پر کیا جاتا ہے جن کے وقوع پذیر ہونے کے امکان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں ہوتی۔ اس قانون کی مدد سے ہم یہ باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی خاص نوعیت کے واقعے کا اتفاقاً پیش آجانے کے امکانات کس قدر ہوتے ہیں۔

مثلاً دس سکے لیے جائیں اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دیں، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دیں۔ اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کریں کہ ایک سکہ نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دیں۔ یہ امکان کہ نمبر ایک نمبر کا سکہ پہلی بار ہمارے ہاتھ میں آجائے، دس میں سے ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک اور دو نمبر سکہ بالترتیب ہاتھ میں آجائے سو میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سکے سلسلہ وار ہمارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں، دس ہزار میں ایک ہے۔ یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب ہمارے ہاتھ میں آئیں، دس ارب میں صرف ایک بار ہے۔[13]

یہ سادہ سی مثال ظاہر کرتی ہے کہ واقعات میں امکان اور اتفاق کا تناسب کتنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس عظیم الشان اور منظم کائنات کا جائزہ لیتے ہوئے اس حساب کو دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ 92 کیمیائی عناصر کے مجموعے میں سے اتفاقاً کاربن، ہائیدروجن، نائٹروجن اور آکسیجن کے اتنے اٹیم الگ نکل آناجن سے صرف ایک پروٹینی سالمہ (Molecule) وجود میں آجائے، صرف اس ایک سالمے کے وجود کا امکان 10^{160} میں سے ایک بار ہے۔ (10^{160} کا مطلب ہے 10 کو 10 سے 160 مرتبہ ضرب دینا)۔ اس سالمے میں بھی امینوایسڈ بننے کے لیے امکان کا تناسب 10^{48} ہے۔ یہ

[13] ماخوذ از: مولانا وحید الدین خان۔ مذہب اور جدید چیلنج، صفحہ 82۔ دار التذکیر۔ لاہور

صرف ایک سالمے (Molecule) کی مثال دی گئی ہے جو کائنات میں ایک ادنی ترین انسان کے جسم میں بھی ایک نہ نظر آنے والی شے ہے، اس کا امکان اس قدر کم ہے تو پھر پوری کائنات کو محض ایک اتفاق قرار دینا کیا بے عقلی نہیں؟ مختلف غیر مرئی ذرات سے وجود پانے والے ایک سالمے سے لے کر اجرامِ سماوی اور کہکشاؤں تک ہر ایک کے ظہور پذیر ہونے کو محض ایک ''اتفاق'' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زمین، اس کا زاویہ، سورج اور زمین کا فاصلہ، چاند، آکسیجن، ہوا، پانی سب کچھ اس قدر ٹھیک ٹھیک موجود ہے کہ زمین پر حیات ممکن ہوسکے۔ ان میں کسی امر میں 0.5% بھی فرق واقع ہوتا تو زندگی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کائنات اس کا Life Friendly ماحول ہونا، یہ سب جدید ریاضیاتی قوانین کے مطابق اربوں میں ایک درجہ امکان رکھتا ہے۔ اگر یہ اتفاق ہی ہے تو ایک شے موزوں ہو، دو شے موزوں ہو، یہ کیا ماجرا ہے کہ پوری کائنات ہی انسانی حیات کے لیے موزوں ترین صورت میں موجود ہے۔ اتفاق سے کبھی کبھار تو خیر پیدا ہوسکتی ہے لیکن مسلسل خیر کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ان سب حقائق اور ان کے درجہ امکانات کو دیکھ کر کوئی منطقی ذہن یہ باور نہیں کرسکتا کہ تخلیق اور اس میں حیرت انگیز نظم وضبط محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔

اگر کائنات کی محض ایک اتفاقی حادثہ ہے اور ہمارے اذہان بھی اسی اتفاقی سلسلے کی ایک کڑی ہے تو جو یہ ساری سائنس کی بنیاد جو انسانی تجربات پر ہے، ان تجربات کو اتفاق کیوں نہیں مان لیا جائے؟ اگر ہم اتفاق پر یقین رکھتے ہیں تو یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ سیب زمین پر اتفاق سے ہی گرتا ہے ہوا میں بھی اُڑ سکتا تھا، سورج کی روشنی زمین پر

اتفاق سے ہی آتی ہے، یہ سب سائنسی دریافت کے متعلق ہم کبھی اتفاق نہیں مانتے تو اتنی عظیم الشان کائنات کے متعلق ''اتفاق'' جیسے غیر علمی دلیل کا استعمال کیونکر کر سکتے ہیں؟ انسانی عقل اور فکر واستدلال کی سلامتی کا تقاضا یہی ہے اس کائنات کو اتفاق جیسے غیر معقول بات سے جوڑنے کے بجائے خدا کے تصور کو قبول کرلے۔

درحقیقت عقل و منطق اور سائنس کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور اس بارے میں سب سے بڑی بدذوقی یہی ہوگی کہ اس عظیم الشان کائنات کو محض اتفاق قرار دے دیا جائے۔

حصہ : چہارم
ملحدین کے عمومی سوالات

خدا کا خالق کون؟

یہ اعتراض یا سوال ذہن میں اکثر اٹھتا ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خالق ہے، تو پھر خدا کا خالق کون ہے؟ اس معاملے جدید ذہن سخت کنفیوژن کا شکار ہے — بالخصوص علت و معلول (Cause & Effect) کی لا متناہی (Endless) بحث کے پیش نظر زمانہ قدیم سے ہی فلاسفہ کے ہاں بحث و مباحثے رائج رہے ہیں، ملحد فلاسفہ اکثر یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا نے کائنات کو بنایا تو خود خدا کو کس نے بنایا۔ ایک جدید ذہن کے لیے بھی یہ سوال اکثر ذہنی پریشانی کا سبب بنتا ہے کہ ہر چیز کا خالق ہے تو خدا کو کس نے تخلیق کیا۔ مگر فی الحقیقت اس سوال پر معمولی سے ہی غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے سوالات اصلا "منطقی مغالطوں غیر منطقی (illogical) سوال ہے۔

1۔ یہ سوال نہ صرف منطق کی نفی ہے کرتا ہے بلکہ مزید یہ کہ مذکورہ اعتراض ایک کھلی تضاد فکری پر مبنی ہے۔ یہ لوگ خود تو کائنات کو بغیر خالق کے مان رہے ہیں، مگر خالق کو ماننے کے لیے وہ ایک خالق خالق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ کائنات کا وجود اگر بغیر خالق کے ممکن ہے تو خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ممکن ہونا چاہیے۔ اگر آپ خدا کے خالق نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں تو پھر لا محالہ آپ کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا چاہیے کہ آپ کے نزدیک اس کا کوئی خالق نہیں۔ جب کائنات کو بغیر کسی

خالق کے مانا جاسکتا ہے تو پھر خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ماننا غلط نہیں ہونا چاہیے۔ عقلی اعتبار سے بھی ایک صاحب حکمت اور مدبر ہستی کو خالق ماننا زیادہ معقول ہے بنسبت اس کے کہ ہم بے شعور مادے کو بغیر کسی خالق کے مان لیں۔

2۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق ہوتا ہے تو یہ سوال اس لیے خدا پر لاگو نہیں ہوتا کہ خدا کوئی مادی شے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی خالق ہے، خدا چونکہ 'مخلوق' نہیں ہے اس لیے اس کا کوئی خالق بھی نہیں ہے۔

3۔ جدید منطق و فلسفہ کا بیان کردہ ایک اہم مغالطہ کٹیگری مسٹیک (category mistake) کہلاتا ہے۔ یعنی ہر وجود کو ڈیفائن کرنے والی صفات کی وجہ سے اس کے متعلق بعض سوالات از خود ہی غیر متعلق یا غیر منطقی ہو جاتے ہیں جو کسی دوسری صفات کے حامل وجود کے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ "یہ انڈے کس درخت میں اُگے؟ بالکل ہی غیر متعلق ہے۔ یا بوتل بنانے والی مشین کے بارے میں پوچھنا کہ یہ مشین کون سی بوتل میں بنی ہے؟ بالکل ہی غیر منطقی ہے۔

اسی طرح خدا ڈیفائن کرنے والی ایک بنیادی صفت الصمد یعنی قائم بالذات اور خالق یعنی تخلیق کرنے والا ہے۔ جب اپنی تعریف میں ہی وہ اس کائنات کا خالق ہے تو پھر اس پر مخلوق ہونے کا سوال کیونکر کیا جاسکتا ہے؟

4۔ایک اور بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ ہم اس معاملے میں کائنات کے اصول علت و معلول کا اطلاق خدا پر کر رہے ہوتے ہیں۔یعنی اس دعوے کے بعد کہ اگر ہر چیز کی کوئی علت ہے تو خدا کی علت کیا ہے؟ پہلے یہ طے کیا جائے گا کہ کیا کائنات اس اصول علت و معلوم کا اطلاق خدا پر بھی ہوتا ہے؟ تو جواب ظاہر ہے کہ جب خدا نے کائنات بنائی ہے تو اس پر کائنات کے مادی قوانین کا اطلاق نہیں ہو گا۔

ہر چیز کا خالق ہونے، یا علت و معلول کا قانون اس کائنات کے لیے ہے۔ جبکہ خدا اس کائنات کے قوانین سے ماورا ہے۔ لہٰذا اسے قائم بالذات ماننا ضروری اور علت و معلول کا اطلاق اس کے خالق پر کرنا غیر منطقی ہے۔اس کا وجود کائنات کی سرحدوں سے ماورا ہے۔

5۔خدا کے خالق کے بارے میں سوال اس لحاظ سے بھی درست نہیں کہ اس میں ایک متعین وقت میں خدا کے تخلیق ہونے کو فرض کر لیا گیا ہے۔ جبکہ وقت صرف کائنات کا حصہ ہے۔ اور خدا کائنات کا خالق ہے۔خدا کو موجود ہونے کے لئے کسی وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس وقت سے ہے جب وقت کا وجود بھی نہیں تھا۔ چنانچہ خدا وجود میں نہیں آیا بلکہ خدا ہمیشہ سے موجود ہے۔

6۔ہم نے اس کائنات کا مشاہدہ کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کائنات ازلی نہیں ہے۔اس کا ایک نکتہ آغاز ہے۔

خدا نظر کیوں نہیں آتا

مذہب کا بنیادی مقدمہ ہی یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کی زندگی کے طور پر نہیں بنایا۔ یہ چند سالہ زندگی امتحان کے طور پر ہے جس میں کامیابی کی صورت میں ہمیں ہمیشہ کی زندگی نصیب ہو گی۔ اگر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نظر آتا تو پھر کسی امتحان کی گنجائش موجود نہ رہتی۔ کون ایسا ہوتا جو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس کی نافرمانی کا سوچتا؟ اس دنیا کا امتحان اصل میں نیکی و بدی میں سے کسی ایک کے انتخاب (Choice) کا امتحان ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ اسی خالق نے واضح نشانیوں کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا ہے۔ اب یہ ہماری عقل کا فیصلہ ہے کہ ہم نے کون سی راہ اختیار کرنی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ امتحان یہ نہیں ہے کہ ہم کبھی کوئی گناہ نہ کریں۔ امتحان دراصل یہ ہے کہ ہم مجموعی طور پر اپنی زندگی، اپنے رب کے سرکش بندے کے طور پر نہیں بلکہ فرمانبردار بندے کے طور پر بسر کریں۔ اگر اس میں کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو جذبات کے غلبے سے نجات پاتے ہی سچے دل سے توبہ کریں اور اس کی طرف رجوع کریں۔ جو لوگ اس میں کامیاب ہوں گے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اپنا دیدار کروائے گا اور اپنی جنت میں انہیں شرف ملاقات بھی بخشے گا۔ اُس وقت وہ رب العزت اپنی تمام تر طاقت و کبریائی کے ساتھ سارے عالم کے سامنے ظاہر ہو جائے گا لیکن وہ وقت ایمان

لانے کا نہیں نتائج کا ہو گا۔ ہمارے دوست سید اسرار احمد بخاری کہا کرتے ہیں کہ دنیا میں دلیل خُدا کی نمائندہ ہے جس کے پیچھے سوائے اخلاقی ذمہ داری کے اور کوئی "طاقت" نہیں کہ جس سے ڈر کر انسان حق کو تسلیم کر لے۔ جو لوگ دلیل کے سامنے اکڑ جائیں اور طاقت کے آگے جھک جائیں اُن کا پھر یہی انجام مقدر ہے کہ وہ تاابد خُدا کی "طاقت" کا مزہ چکھیں۔

بن دیکھے خدا پر یقین کیوں؟

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سائنسی علم 'ایمان باالشہود' کا قائل ہے، جبکہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے 'ایمان بالغیب' لازم ہے۔ اس سے لازمی یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک ہستی حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آسکتی تو ایک عام انسان کو خدا کے وجود پر کیسے قائل کیا جاسکتا ہے؟

اس بارے میں سب سے پہلے تو اس غلط فہمی کو رفع کر لیجیے کہ سائنس صرف 'ایمان بالشہود' ہی کی قائل ہے۔ عصر حاضر میں بہت سی عظیم علمی حقیقتیں جو سائنس نے دریافت کی ہیں، جنہیں پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ علمی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ سراسر 'ایمان بالغیب' ہی کا ثمر اور نتیجہ ہیں۔ دوسری بات ہمیں یہ سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان بالغیب کے معنی بن دیکھے ماننے کے ہیں' بے سوچے سمجھے' ماننے کے نہیں ہیں۔

ایمان بالشہود یا براہ ساست تجربہ و مشاہدے کو ہی حقیقت سمجھنا تجربیت (Positivism) کہلاتا ہے۔ تجربیت کا فلسفہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے جس کی رُو سے چونکہ مذہبی تصورات مثلاً جنت و دوزخ یا خدا ہمارے تجربے اور محسوسات کی دنیا سے باہر ہے اس لیے اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی میں اس نقطۂ

نظر کے فروغ نے خدا کے عقیدے کو لوگوں کی نگاہ میں بے دلیل بنا دیا اور بہت سے لوگوں نے اسے علمی اور عقلی اعتبار سے بے بنیاد عقیدہ کہہ کر رد کر دیا کہ خدا کا وجود چونکہ براہ راست مشاہدے میں نہیں آسکتا تھا چنانچہ یہ کائنات کی ایک فرضی یا خود ساختہ توجیہہ ہے۔

تاہم بیسویں صدی میں صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ علم کے پھیلاؤ اور وسعت نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ شمار علمی حقائق ایسے ہیں جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہیں ہے، مگر ان کے بالواسطہ اثرات اس قدر واضح اور مبنی بر حقیقت ہیں کہ ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس کی ایک بہت بڑی مثال قانون تجاذبlaw of Gravitation ہے۔ یہ قانون بذات خود بالکل ناقابل مشاہدہ ہے۔ کشش ثقل کوئی مادی شے نہیں ہے جسے کوئی شخص آپ کے سامنے کھڑا کر سکے۔ لیکن اس کے اثرات اس قدر واضح اور حقیقی ہیں کہ اس کا انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔اسی طرح Energy یعنی قوت کو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا، لیکن اس کے کمالات اور کارستانیوں سے سب واقف ہیں۔آج کی سائنس محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ سائنسی حلقوں میں آج جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استنباط پر مبنی ہیں۔

خدا کے عقیدے پر استدلال کی نوعیت بھی یہی ہے۔اگر آفاق و انفس کی نشانیاں خدا کے عقیدے کی تائید کر رہی ہیں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر خدا کے

وجود کا استنباط ہو رہا ہو تو یہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائے گا۔ اگر ایمان بالغیب یعنی استنباطی استدلال کو صرف اس لیے رد کر دیا جائے کہ وہ براہ راست مشاہدے کی چیز نہیں ہے تو اس سے صرف خدا کا عقیدہ ہی نہیں بلکہ سائنس کا پورا قلعہ زمیں بوس ہو جائے گا۔

اسی مسترد شدہ فلسفے کی بدولت مخالفین مذہب دراصل طریقِ استدلال کو نہ سمجھنے کے غلطی میں مبتلاء ہیں۔ وہ مذہب کے ان غیبی امور کو بھی براہ راست (Direct Observation) سمجھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق استنباطی استدلال (Inference reasoning) سے ہے۔ مذہب کے ان امور کا تعلق چونکہ غیبیات سے ہے اس لیے اس پہلو کا مطالعہ براہِ راست استدلال کے بجائے استنباط کے منطقی اصول سے اسی طرح کر کے مطالعہ کر کے تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اس اصول سے آج جدید سائنس کائنات سے متعلق ہونے والی تحقیقات میں ناقابل مشاہدہ امور کو معقول (Valid) سمجھتی ہے۔

دنیا میں شر کیوں ہے؟

خدائے رحیم اور بھوک سے مرتے لوگ

مذہب کے بنیادی مقدمے کے مطابق اس دنیا کو خالقِ کائنات نے انسانوں کے لیے ایک عارضی امتحان گاہ بنایا ہے۔ انسان کو یہاں خیر اور شر اختیار کرنے کی آزادی دی ہے۔ خیر کا رستہ بتلانے کے لیے ہدایات بھی موجود ہیں اور شر کو اختیار کرنے کے لیے آزادی بھی۔

اس عمومی بات کو اذہان میں راسخ کر لینے کے بعد یہ حقیقت بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا کے طول و عرض میں اللہ ربّ العزّت نے اوّل دن سے ہی مختلف صورتوں میں رزق حیات وافر مقدار میں نا صرف یہ کہ مہیا کر رکھا ہے بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ٹیکنالوجی اور علم کی وسعت سے نئے نئے زرائع روز کی بنیاد پر دریافت ہو رہے ہیں۔ ایک طرف جہاں ارض و سماء انگنت ذرائع رزق و روزگار سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف انسان کو عقل کی صورت میں ایسی نعمت دی گئی ہے کہ نہ صرف اپنے لیے رزقِ کثیر حاصل کر سکتا ہے بلکہ نوع انسانی کے محروم طبقوں حتیٰ کہ جانوروں تک کے لیے بھی انتظام و انصرام کی ذمہ داری انجام دے سکتا ہے۔ اسی رزق کا وعدہ قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔ وہ اس کی قرار گاہ کو بھی جانتا ہے اور دفن ہونے کی جگہ کو بھی۔ یہ سب کچھ واضح کتاب (لوح محفوظ) میں لکھا ہوا موجود ہے۔(ہود ۱۱:۶)

یعنی کائنات کی تمام مخلوقات کا رزق اللہ ہی کے ذمّے ہے، اور بلاشبہ پتھر میں چھپے کیڑے ہوں یا سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں اور چٹانوں کے اندر پلنے والی سمندری مخلوق سبھی کو رزق دینے والی ذات اکیلے اللہ رب العزت ہی کی ہے۔ یہ واضح رہے خدا کا دعویٰ یہ نہیں کہ ہر ایک انفرادی شخص کے رزق کا براہِ راست ذمہ دار ہے اور ہر ایک جاندار کو اس کا رزق اس کے دامن میں ڈال دیتا ہے، بلکہ اس آیت کا مطلب ہے کہ اس کائنات میں جاندار پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیے بلکہ ان کے رزق کی فراہمی کا پورا سامان رکھ دیا، پورا بندوبست کر دیا اور سارے اسباب مہیا کر دیئے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ اس رزق کے حصول کے لیے جدوجہد کرے اور اپنے مقدر کا رزق خدا کی عطا سے حاصل کرے۔

دنیا میں انسان کے لیے خیر و شر کی آزادی اور رزق کی فراہمی کا یہ وعدہ، یہ دونوں باتیں پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم مذکورہ سوال پر غور کریں تو باسانی واضح ہو جاتی ہے۔ افریقہ اور تیسری دنیا کے وہ ممالک جہاں غربت و افلاس اور بھوک و ننگ نے

ڈیرے ڈال رکھے ہیں وہ رازق رب کی فیصلے سے نہیں بلکہ کہیں تو صلاحیتوں اور عقل کے عدم استعمال سے اور کہیں صاحبِ مال و ثروت خود غرض انسانوں کی حرص و ہوس کے سبب محرومیت سے دوچار ہیں۔

ایسے محروم لوگوں تک رزق کی ترسیل وانتظام کی ذمہ داری ان پیٹ بھرے لوگوں کی ہے جو پسے ہوئے غرباء کی دادرسی کے لیے پریس کانفرنسز کرتے، میڈیا کے لیے تصویریں کھنچواتے اور ایوارڈز کی لایعنی تقاریب منعقد کر کے سمجھتے ہیں ذمہ داری ادا ہو گئی۔ اگر رزق کی منصفانہ تقسیم (جس کی ذمہ داری انسانوں کی ہے) کی جائے تو روئے زمین پر کوئی ذی روح بھوک سے نا مرے! چنانچہ قدرت اپنا انتظام کر چکی۔ امتحان تو اب میرا اور آپ کا ہے۔

قدرتی آفات کیوں آتی ہیں

قدرتی آفات کے متعلق عام مذہبی حلقوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہیں جو لوگوں پر کثرتِ گناہ کے سبب نازل ہوتے ہیں، میرے محدود علم کے مطابق قرآن و کتب احادیث میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اور اس نظریے کی کوئی بنیاد کتب مقدسہ سے ثابت نہیں کی جاسکتی کہ ہر دور میں جو بھی قدرتی آفات ہیں وہ لازما" خدا کا عذاب ہی ہیں۔ قرآن مجید میں جن قوموں کی آسمانی آفات کے ذریعے عذاب کا ذکر ہے یہ بالکل مختلف صورتیں ہیں۔ قرآن کے مطابق جب پیغمبر کی مخاطب قوم باوجود اس حق کو حق جاننے کے محض اپنی ضد عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب رسول کا انکار کرتی ہے، تو انہیں عذاب سے دوچار کیا جاتا ہے۔ یہ عذاب کسی بھی صورت میں ہو سکتا ہے جس میں قدرتی آفات بھی شامل ہیں۔ رسولوں کے باب میں انکار کے بعد سزا کے اس قانون اتمام حجت کہا جاتا ہے، جو خاتم النبیین جناب رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے بعد اب ختم ہو گیا ہے۔

آپ علیہ السلام کے بعد دنیا میں آنے والے حوادث کے بارے "قطعیت" سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اللہ کا عذاب ہی ہیں، کیونکہ اول تو کسی حادثے کی یہ نوعیت جاننے کے لیے کہ وہ اللہ کا عذاب ہیں یا نہیں ہمارے پاس کوئی واسطہ یا ذریعہ موجود نہیں

ہے، چنانچہ اس طرح کے واقعات کو آزمائش اور عمومی موت کے تناظر میں لینا زیادہ صائب اور درست بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زلزلوں اور قدرتی آفات کے نتیجے میں نیکو کار و گناہ گار، امیر و غریب ، تنگدست و خوشحال سب متاثر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ پیڑ پودے اور بچے بھی لقمہ اجل بن جاتے ہیں اس کی وجہ کوئی عذاب نہیں بلکہ حادثہ ہے۔ جس طرح ایک شخص سڑک کنارے کھڑا ہونے کے باوجود کسی ڈرائیور کی غلطی سے حادثے کا شکار ہو جاتا ہے، اسی طرح ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات ہمارے لیے حادثہ بن جاتے ہیں۔ قدرتی آفات کی صورت میں چونکہ بہت ساری اموات ایک ساتھ مجتمع ہو جاتی ہیں اس لیے ہمیں یہ حادثہ بڑا معلوم ہوتا، اور محسوس یہ ہوتا ہے غالبا "اللہ کا کوئی عذاب نازل ہو گیا ہے، ورنہ غور کیجیے تو یہ بڑا حادثہ بھی روز کی اموات کی طرح ایک موت کا واقعہ ہے جس کی زد میں انسان مجموعی طور پر آجاتا ہے۔

خدا کی عبادت کیوں کی جاتی ہے؟

خُدا کی عبادت در حقیقت دو پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے۔

پہلا پہلو انسان کی فطرت کا ہے۔ انسان کے اندر ایک داعیہ شکرانے کا موجود ہے۔ یعنی ایک سلیم الفطرت شخص اپنے محسن کے احسانات کا شُکر بجالانا چاہتا ہے اور اگر ممکن ہو سکے تو اُن احسانات کا بدلہ اپنی جانب سے کسی اچھے عمل کی صورت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک صالح فطرت شخص ساری کائنات پر غور کرتا ہے اور اسے اپنی خدمت میں لگا ہوا دیکھتا ہے تو بے اختیار اُن نعمتوں کے شکرانے کے طور پر اپنی جبینِ نیاز کو جھکا لیتا ہے اور چاہتا ہے وہ اس ہستی کا شکر گزار ہو جس نے اسے یہ نعمتیں فراہم کی ہیں۔

چنانچہ انسان کو اگر خدا کے وجود کا یقین ہو، اس کے خالق ہونے پر ایمان ہو اور وہ اسے اپنا پروردگار بھی مانتا ہو تو وہ اس کا شکر گزار بھی لازماً ہو گا۔ یہی احساسِ شکر گزاری دراصل عبادت کی بنیاد ہے جس کی تسکین اگر نہ ہو تو انسان اپنے جیسی یا بعض صورتوں میں اپنے سے بھی کم تر مخلوق کی عبادت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بندگی کے انہی جذبات کی تسکین کا لازمی تقاضہ ہے کہ انسان خُدا کی عبادت کرے۔

دوسرا پہلو دراصل مذہب کے بنیادی مقدمے سے متعلق ہے۔ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اس نے دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے تاکہ انسان جنت کی لازوال نعمتوں سے سرفراز ہو سکے۔ یہ امتحان اس بات کا ہے کہ کون خدا کا بندہ بن کر اپنی روح کو گناہ کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے اور بہترین اعمال کر کے خود کو جنت کا حق دار بناتا ہے۔

اسی امتحان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہمہ وقت خدا اپنی ذات کو کو مالکِ کائنات کے سامنے ہمہ تن جھکائے رکھیں اور اس کی مرضی کے مطابق ایک پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خیر و شر کا جو حاسہ ودیعت بھی کیا جسے ہم عرف میں ضمیر کہتے ہیں۔ عبادت در حقیقت اس کو طاقت فراہم کرنے کا ایک عمل ہے۔ انسانی جسم کی طرح روح کا بھی ایک مدافعتی نظام ہے عبادت اس نظام کو فعال اور متحرک رکھتی ہے اور ضمیر کے الارم کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔ جس طرح جسمانی مدافعتی نظام کی حفاظت نہ کی جائے تو جراثیم حملہ کر دیتے ہیں اسی طرح روحانی مدافعتی نظام کے دفاع سے لاپرواہی برتنے کی صورت میں روح پر شیطانی جراثیم حملہ آور ہو جاتے ہیں جو ضمیر کو کمزور کر دیتے ہیں اور اس کی مزاحمت کی طاقت کم ہونے لگتی اور بالآخر برائی سے روکنے کی قدرتی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عبادت انسان کے خُدا سے تعلق کو مسلسل استوار رکھنے اور اُسے خُدا کا تقویٰ اختیار کیے رکھنے میں بھی معاون و مددگار ہوتی ہے۔

خدا کی رحمت اور عذاب

اس میں کوئی شک نہیں کہ خُدا رحمٰن ورحیم ہے، اُس کی رحمت تمام مخلوقات پر وسیع ہے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ماں کا اپنے بچے کے لیے محبت و مامتا کے احساسات کا خُدا کی محبت سے کوئی تقابل کسی طور کیا ہی نہیں جاسکتا، لیکن معاملہ یہ ہے کہ دُنیا میں چونکہ محبت کی انتہاء کو بیان کرنے کے لیے ماں سے زیادہ اچھی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی چنانچہ بطور مثال یہ بات خُدا کی لامحدود محبت اور رحمت کے استعارے کے لیے کہی جاتی ہے کہ وہ ستّر ماؤں سے زیادہ محبت فرماتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اُس کی محبت و رحمت کو ماپنے کے لیے تمام پیمانے چھوٹے اور لُغت میں پایا جانے والا ہر استعارہ ہیچ و حقیر ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آیا وہ اس قدر محبت و رحمت کے باوجود جہنم کی سزا کیونکر دے سکتا ہے، ایک ماں جب اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈال سکتی تو جو رب ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت فرماتا ہے وہ کیسے آگ کی سزا دے سکتا ہے؟ تو یہ سوال دراصل اس خیال کی بنیاد پر پیدا ہوا کہ گویا خُدا "صرف" رحمٰن ورحیم ہی ہے۔

خُدا اگر "صرف" محبت ہی کرتا تو وہ "ماں" تو ہو سکتا تھا، خُدا نہیں، وہ نا صرف یہ کہ لامحدود محبت و رحمت کا مالک ہے بلکہ عادل و منصف بھی ہے، جبّار و قہّار

بھی ہے، اور لاریب اس کی صفت رحمت میں سمندروں سا جوش بھی ہے اور کبھی نا ختم ہونے والا دوام بھی، لیکن چونکہ وہ خُدا ہے اور اپنی صفات میں کامل بھی،۔۔۔۔ لہٰذا اس کی رحمت اس کے عدل و انصاف کے ظہور کو ناقص نہیں کرتی، وہ کسی کمزور ماں کی طرح محبت و مامتا سے لاچار و مجبور ہو کر انصاف کے تقاضوں پر سمجھوتہ (compromise) نہیں کرتا، اس کی رحمت بے شک عمومی ہے اور ہر مخلوق پر وسیع بھی، لیکن اسکی صفت عدل و انصاف سرکش فرعونوں اور ظلم و بربریت کا بازار گرم رکھنے والوں کے لیے نوشتہء دیوار بھی ہے کہ جب فیصلے کا دن آئے گا تو کوئی بھی ظالم اس کے آہنی شکنجے سے بچ نہیں سکے گا۔

دنیا کی کوئی عدالت قتل و فساد برپا کرنے والوں کو کسی بھی محبت و رعایت کا مستحق نہیں سمجھتی اور ہر حال میں سزا کے نفاذ کو ضروری سمجھتی ہے، وہاں کوئی مجرم بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب ثابت ہونے کے باوجود باعزت بری ہو جائے تو قیامت ڈھا دی جاتی ہے کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا، پھر خُدا کے متعلق کسی ناانصافی اور بے عدل فیصلوں کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔!

آخرت میں سزا کی مدت

ملحدین عقیدۂ آخرت پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ انسان دنیا کی قلیل سی زندگی میں جرم کرتا ہے، لیکن مذہبی عقائد یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس قلیل سی مدت کے گناہوں کے بدلے میں آخرت کی طویل سزا پائے گا جو کہ سراسر ظلم ہے۔ یہ اعتراض

دراصل اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ عادلانہ سزا کے لیے جرم واقع ہونے والے وقت اور سزا کے وقت میں نسبت قائم ہونا ضروری ہے یعنی جتنی مدت میں جرم ہوا اتنی مدت تک ہی سزا ہو۔ حالانکہ جرم اور سزا کا تعلق وقت کی نسبت سے نہیں بلکہ اس کے نتیجے میں ہونے والے اثرات ہوتا ہے۔ لہٰذا جرم اور سزا وقت میں یہ نسبت قائم کرنا نہ صرف عقل اور عدل کے خلاف ہے بلکہ اس سے کئی مضحکہ خیز نتائج بھی نکلیں گے۔ مثلاً آپ چوری کے عمل کو دیکھیں؛ چور چند لمحوں میں چوری کرتا ہے مگر اس عمل کی اسے زیادہ مدت تک کی سزا دی جاتی ہے۔ ایک شخص کسی بم کے ذریعے بہت قلیل وقت میں جتنے انسانوں کا قتل کر سکتا ہے، ماضی میں ظالم بادشاہوں نے اس سے بہت زیادہ وقت لگا کر اس سے کم انسان قتل کیے، تو کیا انھیں زیادہ وقت لگانے کی وجہ سے زیادہ سزا دی جائے گی؟ اسی طرح اس مفروضے پر اور بھی بہت سی مثالیں قیاس کی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سزا کے متعلق یہ جرم سے ہونے والے اثرات کو پیش نظر رکھا جائے نہ کہ وقت کو۔

مذہب انسانی آزادی پر قدغن کیوں لگاتا ہے؟

یہ اعتراض بھی بالعموم مذہب پر کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی زندگی پر بے جا پابندیاں عائد کرتا ہے اور وہ تمام چیزیں جو زندگی کو رونق و رنگینی بخشتی ہیں، انسان کے نفس کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہیں، مذہب ان پر قدغن لگا دیتا ہے۔ مثلاً دو مرد اگر باہمی رضامندی سے شادی اور جنسی تعلق کے ذریعے تسکین چاہتے ہیں تو مذہب اس عمل کو گناہ اور برا عمل قرار دیتا ہے حالانکہ یہ معاملہ ان دونوں فرد کا ذاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں شراب نوشی، اباحیت، غیر اخلاقی کاروبار وغیرہ کی دی جاتی ہیں کہ مذہب کا ان میں عمل دخل بے جا اور فرد کی نجی زندگی پر غیر ضروری پابندیاں ہیں۔

اس اعتراض کے پیچھے دراصل یہ مفروضہ ہے کہ فرد کا انفرادی عمل معاشرے پر کسی بھی طرح اثر پذیر نہیں ہوتا۔ اگر انسان کسی جنگل میں تنہا زندگی بسر کرتا ہو، اسے کسی معاشرے کی ضرورت نہ ہو تو یہ مفروضہ کسی اعتبار سے درست مانا جاسکتا ہے مگر ہم جانتے ہیں حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے تو ایک ناتواں وجود ہوتا ہے اور اسے ایک خاندان کی ضرورت ہوتی ہے، اور بڑھاپے تک وہ اپنی انفرادی ضروریات بھی پوری کرنے کے لیے سماج کا محتاج ہوتا ہے۔ سماج اسے وہ تمام سہولیات مثلاً خاندان، ریاست، پڑوسی، حلقۂ احباب مہیا کرتا ہے جو اس کی ذات کی نشو نما کے لیے ضروری ہے۔ اب یہاں دو صورتیں ہیں، یا تو فرد یہ سہولیات حاصل

کر کے اسی سماج کے خلاف عمل پیرا ہو جائیں، یا پھر احسان مندی کے ساتھ ان سب حقوق کی وصولی کے ساتھ ہی وہ اخلاقی طور پر اس بات کا پابند بھی ہو جائے کہ وہ سماج کی حفاظت کرے گا اور اپنے کسی عمل سے اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔

مذہب اسی دوسری صورت کو لازم قرار دیتا ہے اور فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسا کوئی بھی عمل نہ کرے جس کے منفی اثرات اجتماعی سطح پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم جنس شادی بظاہر تو دو فرد کا باہمی معاملہ ہے مگر اجتماعی سطح پر اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے نسل انسانی کا اجراء منقطع ہو جاتا ہے اور خاندان کے ادارے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اسی طرح فحش فلمیں بظاہر تو ایک کاروبار ہے جس سے پیسہ کمایا جاتا ہے مگر اجتماعی سطح پر اس کے نقصانات یہ ہے کہ معاشرہ تعمیری کاموں کے بجائے جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مذہب، بالخصوص اسلام فرد کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ انفرادی سطح پر بھی کسی ایسے عمل کو انجام دے جس سے اجتماعی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوں۔

مذاہب میں اختلاف کیوں؟

تعلیم یافتہ لوگوں کی نسبت یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ یہ جملہ کہہ کر کہ "سائنسی علوم میں اختلاف نہیں پایا جاتا" دراصل تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ علم کا کوئی سا بھی شعبہ ہو اور علماء کی کوئی سی بھی جماعت، خواہ اس کا تعلق سائنسی علوم سے ہو یا سماجی علوم سے، مذہب سے ہو یا فلسفے سے، معیشت سے ہو یا معاشرت سے، اُن میں علمی اختلاف کی حیثیت بنیادی ترین کلید کی ہے۔

ایک مثال Economics کی تعریف Definition ہی کو لیجیے، اس میں بھی اہل علم کے تین گروہ ہیں، کلاسیکل، نیو کلاسیکل اور ماڈرن اکنامسٹس، اور دلچسپ و حیران کن بات یہ ہے کہ تینوں گروہوں کے مابین اکنامکس کی فروعات ہی میں نہیں بلکہ بنیادی تعریف ہی میں بعدالمشرقین کا فرق ہے، گویا اکنامکس کیا ہے، صرف اس ایک بنیادی تعریف ہی پر اہل علم کا اتفاق نہیں ہے اور وہ تین مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔

اسی طرح دیگر شعبہ ہائے علم کو یکے بعد دیگرے دیکھتے جایئے، فزکس جیسے خالصتاً مادی سائنس میں بھی مختلف مکاتب فکر موجود ہیں۔ تخلیق کائنات کے بارے میں بھی ایک سے زائد نظریات مثلاً بگ بینگ، اسٹرنگ تھیوری وغیرہ ہیں۔ سماجی

علو ممیں سے ہر ایک کے مفروضات و نظریات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لہذا نہ صرف یہ کہ یہ کبھی متفق الرائے نہیں ہو سکتے، بلکہ پالیسی سازاداروں پر جس کا سیاسی زور چلتا ہے وہ اپنے نظریئے سے ہم آہنگ پالیسیاں معیشت و معاشرت پر مسلط کر کے کروڑوں انسانوں کے مستقبل کو اپنے نظریات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے تختہ مشق بنادیتا ہے۔

غرض کہ سائنسی علوم میں بھی اختلاف رائے اور مکاتب فکر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ویسا ہی بے کنار ہے جیسا کہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے مذاہب میں پایا جاتا ہے، اور اس کی وجہ مذہب یا سائنس نہیں بلکہ دراصل انسانی اذہان کا مختلف الخیال ہونا ہے، ایک ہی حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے میں ہر دوسرا اہل علم نئے زاویئے اور نئے سے نئے خیالات کی بنیاد پر دیکھتا ہے اسے سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔

لہٰذا اختلاف رائے اور مکاتب فکر کی کثرت کی بنیاد پر مذہب کی تقصیر و تحقیر کرنا ایک مبنی بر تعصب رویہ ہے۔ اگر اختلاف کی بنیاد پر مذہب کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ تمام سائنسی علوم کا بھی انکار کر دینا چاہیے کیونکہ یہ بھی اختلافات ی زد میں ہی ہیں۔

حصہ: پنجم
ضمیمہ

شہد کی مکھی

ہمارے گرد و پیش مخلوقات میں جانور، انسان، چرند پرند سبھی شامل ہیں۔ان مخلوقات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان سے ایسی صفات اور حرکات کا ظہور ہوتا ہے جو انتہائی منظم اور پیچیدہ ہیں۔ یہ مخلوقات اس بات کا شعور اچھی طرح رکھتی ہے کہ کس طرح انھیں اپنی نسل کی بقا اور اپنی جان کی حفاظت کرنی ہے۔موسموں کے تغیر کے مطابق ہجرت، مخصوص علاقے میں انڈے دینا اور واپس لوٹ آنا یہ سب انتہائی حیرت انگیز ہے۔ان غیر ذی عقل حیوانوں کی تعلیم کے لاکھوں مناظر دنیا میں ہے جس کی ایک ایک واضح مثال شہد کی مکھیوں کا شہد بنانے کا عمل ہے۔

موجودہ دور میں سائنس دانوں (Entomologists)نے نہایت دقتِ نظر کے ساتھ شہد کی مکھیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔اسی مطالعے میں معلوم ہوا ہے کہ اس معمولی سی جسامت کے حامل مگر عجیب و غریب جانور کا اجتماعی طرز حیات کئی حوالے سے انسان کو ورطہ حیرت میں غرق کرنے کے لیے کافی ہے۔ بالخصوص ان کے شہد بنانے کا عمل نہایت ہی منظم اور مربوط ہے۔

شہد کی مکھی شہد بنانے کے عمل کا آغاز پھولوں سے امرت (Nectar)اکٹھا کرنے سے کرتی ہے۔امرت ایک میٹھا رس ہوتا ہے جو

پھولوں میں زیادہ تر شکری مادے سے بنتا ہے۔ مکھیاں اپنی زبان سے یہ رس چُوس اپنے پیٹ میں جمع کر کے چھتّے تک پہنچاتی ہے۔ چھتے میں ایک اور شہد کی مکھی اس رس کو اپنے مُنہ میں لے لیتی ہے اور کچھ دیر تک اسے چباتی رہتی ہے۔ اس طرح شہد کی مکھی کے مُنہ میں موجود کیمیائی مادہ (انزائیم) بھی اِس رس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مکھی رس کو چھ کونے والی موم کی خلیوں میں جمع کرتی ہے۔ اب دیگر مکھیاں اپنے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر ہوا کی حرکت کو تیز کرتی ہے تاکہ شہد میں سے اضافی نمی سوکھ جائے۔ اس کے بعد مکھیاں خلیوں کے مُنہ کو موم کی ایک باریک تہہ سے بند کر دیتی ہیں۔ اس طرح ذخیرہ اندوزی سے شہد ہزاروں سال تک خراب نہیں ہوتا۔ یہ سارا عمل شہد کو ایک صحت بخش اور دیرپا غذا میں تبدیل کر دیتا ہے۔

عقل و شعور کی حامل ہستی انسان جب اس طرح کا کوئی عمل کرتی ہے تو اس کے پیچھے برسوں کے تجربات کا علم شامل ہوتا ہے۔ آج کا جدید انسان بھی اس طرح کی پیداوار کے لیے بہت سے علوم بالخصوص کیمسٹری کی مدد لیتا ہے۔ ایک وٹامن سپلمنٹ کے پیچھے کئی برسوں کی تحقیق کارفرما ہوتی ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ مکھیوں کے پاس نہ ہی حصول علم کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ ہی انسانی عقل اس عمل کو محض کیمیکل ری ایکشن یا اتفاق کہہ سکتی ہے لیکن اس کے باوجود لاکھوں برس سے مکھیاں یہ عمل کر رہی ہیں۔ اس عمل کو قرآن مجید سے اہل فکر کے لیے ایک بڑی نشانی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنْ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنْ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

تیرے پروردگار نے (نظام فطرت کے تحت) شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو عرشے لوگ بناتے ہیں ان میں گھر بنانا۔اور پھر تمام پھلوں سے کھا اور جو راستے تیرے پروردگار نے تیرے لئے معین کئے ہیں ان میں راحت سے چل پھر ۔ان کے بطن سے پینے کی ایک خاص چیز نکلتی ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔اس امر میں اہل فکر و نظر کے لئے بڑی نشانی ہے۔(سورۃ النحل۔آیت 69-68)

مکھیوں کے اس عمل کی تنہا توجیہہ یہی ہوسکتی ہے کہ انھیں کسی خارجی ذرائع سے ان اعمال کے متعلق ہدایات مل رہی ہیں اور وہ بعینہ ان ہدایات کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں۔انھیں فطری طور پر کسی ایسی ہستی کی رہنمائی حاصل ہے جو فطرت کے کیمیائی قوانین سے واقف ہو۔بلاشک وہ ہستی ان قوانین کے خالق کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی۔

کائنات کا نظم اور وجود خداوندی

کائنات کے متعلق ملحدین کا یہ نظریہ تھا کہ یہ بے ترتیب(Random) ہے اور اس میں موجود تمام مادے، قوت اور اجرام فلکی ایک اندھے قانون کے تحت چل رہے ہیں جو محض ایک اتفاق سے پیدا ہو گئے۔ لیکن 1900 کے آخری دور میں سائنس دانوں کے سامنے جب کارخانہ کائنات کے مزید قوانین دریافت ہوئے تو انھوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ یہ کائنات مکمل نظم اور توازن (Balance) کے ساتھ قائم ہے۔ جس میں معمولی سی تبدیلی بھی یہاں زندگی کے سرے سے معدوم ہونے کے لیے کافی تھی۔ تخلیق کائنات کی توجیہ جو بھی کی جائے، یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام طبیعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین نے بالکل اسی طرح کام کیا جیسا کہ انسانی زندگی کے وجود کے لیے ناگزیر تھا۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو Anthropic-Principal کا نام دیا۔

سائنس دان مزید کہتے ہیں کہ زمین کا سائز، اس کے جھکاؤ کا زاویہ، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی، فضا اور دیگر عناصر کی کیمیائی خصوصیات اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب سے موجود ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر تھا۔ اگر اس سارے نظام میں 0.5% بھی فرق واقع ہو جائے تو اس دھرتی پر انسانی زندگی ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ

سوال انسان کا ذہن ضرور کرتا ہے کہ ایسا منظم اور مرتب نظام کسی مافوق الفطرت ہستی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد بھی کوئی کہتا کہ کائنات کا کوئی ایسا خالق نہیں ہے جس نے یہ سارا نظام قائم کیا ہو؛ بلکہ یہ سب خود بخود قائم ہو گیا تو گویا ایسا ماننا ہے کہ ایک گودام میں دوات اور سیاہی رکھی ہے، اور اچانک ایک دھماکہ کے بعد گودام میں ایک طرف غالب کا دیوان تیار ہو گیا۔!!!

الحاد کی وجوہات اور اس کے سد باب کی حکمت عملی

یورپ میں الحادی فکر کے محرکات اور موجودہ مسلمان

امت مسلمہ اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے؛ یہ دور ہماری تاریخ کا مشکل ترین دور ہے۔ سیاسی و معاشی اعتبار سے مغلوبیت علیحدہ، فکری اعتبار سے بھی ہم اقوامِ عالم سے بہت پیچھے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اب اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ الحاد یعنی مذہب بیزاری کی گمراہی آج صرف مغرب تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ بنتا جارہا ہے، حتیٰ کہ ہماری مذہب پسند مشرقی تہذیب بھی اس کی لپیٹ میں ہے اور معاشرے میں متعدد افراد کسی نہ کسی درجے میں دہریت کا شکار ہورہے ہیں ۔الحادی تہذیب آج اپنی پوری شدت کے ساتھ مشرق و مغرب میں اپنا غلبہ حاصل کر رہی ہے اور مگر بدقسمتی سے ہم بحیثیت مجموعی اُس حکمت عملی سے اب تک نظر چرائیں ہوئے ہیں جس کی مدد سے ہم اس فتنے سے نبرد آزما ہو سکیں۔

حالات کے تناظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت امت کے علماء پر یہ واجب ہے کہ علم و فکر کے میدان میں مجاہد کی طرح اتریں اور اپنے اپنے محاذ کا تعین کرتے ہوئے اس جہادِ عظیم میں شریک ہوں تاکہ موجودہ دور کے اس چیلنج کا بھرپور مقابلہ کیا جاسکے۔ اس حوالے سے الحاد کے تدارک کے لیے سب سے پہلی چیز جو اشد

ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اُس مذہبی فکر اور اُن رویوں کی طرف توجہ دیں جو الحاد کے فروغ کے اہم محرکات بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں محرکات کے تعین اور ان سے آگہی کے لیے یورپ کی مذہبی تاریخ کو سمجھنا بدیہی طور پر لازم ہے تاکہ ہم ان غلطیوں کو دہرانے سے گریز کریں جو الحاد کی پیدائش میں دیگر اسباب کے ساتھ برابر کی ذمہ دار ہیں۔

چودھویں سے سولہویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا جب یورپ میں الحاد نشاۃِ ثانیہ کے بعد ایک فکری تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ نشاۃِ ثانیہ کے محرکات دسویں صدی جبکہ اس کا اصل دور پندرھویں صدی تھا جب عیسائیت یورپ کا غالب مذہب تھا مگر مذہبی طبقے نے اپنے رویوں میں ایسی کوئی کثر نہ چھوڑی تھی کہ لوگ مذہب سے بیزار نہ ہوں۔ اس تاریخ سے جو بنیادی عوامل الحاد کے فروغ کے ضمن میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ مغرب میں الحاد اور جدیدیت در آنے کی پہلی وجہ مذہبی رہنماؤں کا وہ طبقہ تھا جن میں بے شمار اخلاقی خرابیاں اور شدت پسندی پیدا ہو چکی تھیں۔ پادری خورشید عالم کہتے ہیں کہ کلیسا کی روحانی اور اخلاقی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی اور پوپ صاحبان کا اخلاقی کردار بالکل گر چکا تھا۔[14] زناکاری، تعصب، کرپشن، باہمی بداخلاقی، تعیشات پسندی اور مذہبی تکبر ان میں بالکل عام تھا۔ ان خرابیوں نے مذہب کا حلیہ بھی بگاڑ رکھا

[14] ڈاکٹر نادر رضا صدیقی، **تاریخ کلیسا** (پاپائیت اور اس کی سرگذشت)، ص: 611

تھا اور بہت سے اخلاقی رذائل کو بھی کلیسا بالخصوص پوپ کی جانب سے بھی مذہبی پشت پناہی حاصل تھی۔ مارٹن لوتھر پروٹسٹنٹ فرقے کے بانی اور اُن سنجیدہ مذہبی لوگوں میں سے تھے جن کی جانب سے مذہبی رہنماؤں کی اصلاح کا مطالبہ ہمیشہ کیا جاتا رہا مگر ان کا مطالبہ جب بے نتیجہ رہا تو ردعمل میں پروٹسٹنٹ تحریک کا ظہور ہوا جو درحقیقت یورپ کے مجموعی نظام فکر میں جدیدیت کا پہلا بیج تھا۔

۲۔ عیسائیت میں باہمی فرقہ وارانہ فضا نے بھی الحاد کے فروغ میں ایک اہم محرک کے طور پر اپنا کردار ادا کیا ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے قبل عیسائی علماء کی محفلوں کے موضوع عجیب و غریب اور عملی زندگی سے غیر متعلق موضوعات ہوا کرتے تھے۔ اور ان مباحث پر ہونے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے باہمی اختلافات محض علمی اختلافات نہیں بلکہ تنازع کی شکل اختیار کر چکے تھے اور دونوں فرقے ایک دوسرے باہم برسرپیکار ہو چکے تھے۔ جب کبھی جس فرقے کے ہاتھ میں طاقت آتی وہ دوسرے فرقے کو کچلنے کی کوشش کرتا۔ یہ معاملہ دسویں صدی عیسوی سے قرونِ وسطیٰ تک جاری رہا۔ عماد الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''۱۰۵۳ء میں روم اور قسطنطنیہ کے مراکز نے ایک دوسرے کو خارج از امت قرار دے دیا اور اُن کے اپنے اپنے حلقۂ اثر سے متعلق تمام عیسائی مراکز اس فیصلے میں شریک ہو گئے۔ اُس وقت سے قسطنطنیہ کے مرکز نے یونانی راسخ العقیدہ کلیسا کے نام سے اپنے آپ کو الگ عیسائی امت بنا لیا اور

عقائد اور رسوم و رواج کے خفیف سے اختلاف کے علاوہ، رومی کیتھولک کلیسا سے تعصب کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے بعد جب صلیبی جنگوں کے دوران ۱۲۰۴ء میں رومن کیتھولک فوجوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں زبردستی رومن کیتھولک مسلک کو رائج کرنے کی کوشش کی تو فریقین کے درمیان تنفر اور اختلافات کی بنیاد مستقل ہو گی۔"[15]

سولہویں صدی کے وسط سے سترہویں صدی کے وسط تک کا زمانہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے درمیان تنازع لِبقا سے عبارت ہے۔[16] اس تنازع اور مذہبی جنگ میں کلیسا کے ہم قدم ان کے بادشاہ بھی شریک تھے اور کلیسا کے حکم پر جنگوں سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

"کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کی حمایت میں یورپ کے ریاستی حکمرانوں اور بادشاہو کے درمیان جو صف بندی ہوئی، اس نے جہاں پروٹسٹنٹ کلیسا کو ایک مستقل حیثیت اختیار کرنے میں مدد دی، وہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ریاستوں کے درمیان ایک ایسی جنگ کا آغاز کیا جو تقریباً ایک

[15] عماد الحسن فاروقی۔ **دنیا کے بڑے مذاہب۔ صفحہ ۳۱۷۔** مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور ۱۹۹۰ء

[16] عماد الحسن فاروقی۔ **دنیا کے بڑے مذاہب۔ صفحہ ۳۲۰۔** مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور ۱۹۹۰ء

سو سال تک جاری رہ کر سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں ہی جا کر ہی ختم ہو پائی۔"[17]

اس صورت حال میں کئی متفکر اذہان مذہب کی اس باہمی چپقلش سے پریشان تھے۔ چنانچہ اس دور کے مذہب مخالف فلسفی اور مفکرین مذہبی اختلافات اور فرقہ واریت پر شدید تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لائخل مذہبی اختلافات اور تکفیری مہم سے بیزار افراد نے الحاد کی راہ اختیار کی کیونکہ یہی وہ دامن تھا جہاں انھیں کسی تکفیر کا خوف نہ تھا۔

۳۔ کلیسا کا مطالبہ تھا حکومت میں ان کا مذہبی اثر ورسوخ ہر حال میں ہونا چاہیے اور تمام تر فیصلے ان کی صوابدید پر ہونے چاہیے جبکہ بادشاہ محض ایک مخصوص دائرے میں ہی مذہبی طبقے کو قبول کرنے پر راضی تھے۔ اس صورت حال میں پوپ یعنی کلیسا اور پولیٹیکل لیڈرشپ کے درمیان اختلاف اور تنازعات شروع ہو گئے تھے۔ شہنشاہوں اور پوپوں کے درمیان وقتاً فوقتاً کشمکش جاری رہتی تھی۔ کبھی شہنشاہ مذہبی مجلس کے ذریعے سے پوپ کی معزولی کا انتظام کرالیتا، کبھی مقامی باشندے زور پکڑ کر شہنشاہ کے مقرر کیے ہوئے پوپ کو باہر نکال دیتے۔[18] حتیٰ کہ پوپ انوسینٹ سوم (۱۲۱۶ء) کے

---

[17] ایضاً

[18] ولیم ایل لینگر۔ **انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم**۔ ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر۔ صفحہ ۴۰۰۔ الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰

دور میں پاپائیت ایک مستحکم نظام بن چکا تھا۔ ڈاکٹر نادر رضا صدیقی اس صورت حال پر لکھتے ہیں:

> ''یورپ کے بادشاہوں اور پوپوں میں آئے دن کشمکش رہنے لگی۔ اگر بادشاہوں کو موقع ملتا تو وہ پوپوں کے خاص علاقوں اور جاگیروں کو تباہ و برباد کر دیتے' پائمال کرتے اور اپنی رعایا سے کہتے کہ یہ مذہبی پیشوا نہیں بلکہ دجال ہیں۔ دوسری جانب پوپ بادشاہوں سے اس طرح بدلہ لیتے کہ ان کو دائرہ مذہب سے ہی خارج کر دیتے۔ کسی بادشاہ یا کسی اور شخص کو بلکہ کسی پورے ملک کو کلیسا سے خارج کر دینا تقریباً روز کا معمول تھا۔''[19]

پوپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی ہی وجہ سے اکثر بادشاہوں نے ایسی صورت میں پروٹسٹنٹ تحریک کی سرپرستی کی اور نتیجتاً کلیسا جو ایک مضبوط روایت پسند ادارہ تھا، سیاسی اثر ورسوخ کی کشمکش کی نذر ہو گیا۔ روایت پسندی کے زوال میں پروٹسٹنٹ کے فروغ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے دوسرے حکمرانوں کو بھی موقعہ دیا جو اپنی بادشاہتوں کو پوپ کے کنٹرول سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔[20] پاپائیت کا یہ زوال واضح طور پر پندرہویں صدی کے بعد سے مختلف خطوں میں ٹھیٹھ جمہوریت اور

---

[19] ڈاکٹر نادر رضا صدیقی، **تاریخ کلیسا** (پاپائیت اور اس کی سرگذشت)، ص: 612

[20] عماد الحسن فاروقی، **دنیا کے قدیم و جدید مذاہب**۔ صفحہ ۳۰۴۔ تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۶

سیکولرازم کے معاہدوں کی صورت میں سامنے آیا جس نے اجتماعی سطح پر الحادی نظام فکر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۴۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب اناجیل مسیحی دور کے آغاز کا یہ مجموعی منظر بیان کرتی ہے کہ یہودی فقہاء/فریسی مذہب کی اخلاقی و روحانی تعلیمات کے بجائے ظواہر پرستی میں مبتلاء ہو گئے تھے۔ ان کا سارا زور مذہب کی ظاہری ہیت اور مذہبی حلیے کی بقا پر تھا۔ ان میں اس بات کی اہمیت تھی کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھو لیے جائیں یا عبادت کرتے ہوئے فلاں فلاں عمل و حرکت بالکل اسی حساب سے کی جائے جس طرح ان کے علماء نے لکھا ہے۔ چنانچہ اہم ترین اخلاقی و روحانی تعلیمات بالکل بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس رویے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شدید تنقید کی تھی جس کی شہادت ہم انجیل اربعہ میں دیکھ سکتے ہیں، مگر یہ رجحان بدستوں یہودیوں میں موجود تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سیدنا مسیح کے نام لیوا بھی اس ظاہر پرستی کے مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ مذکورہ صورت حال اس کی واضح ترین مثال ہے جہاں مذہب کو انفرادی زندگی میں لاگو کرنے کے بجائے اجتماعیت میں مذہبی طبقے کو مسلط کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مذہب کی اصل روح اوجھل ہونے اور ظاہر پرستی کے رواج نے کئی حساس ذہنوں کو مذہب کے مخالف کر دیا کیونکہ ان کے لیے ایسا خدا اور مذہب بالکل بے سود تھا جو محض چند ظاہری اعمال پر انسانی زندگی اور اس کی آخرت کو موقوف کر دے۔

۵۔ تیرہویں صدی سے پہلے یونانی فلسفے کو کم و بیش وہی حیثیت حاصل تھی جو آج جدید سائنس کو حاصل ہے۔ عیسائی ماہرینِ الٰہیات یونانی فلسفے کے اس سحر میں بری طرح مبتلاء تھے چنانچہ انھوں نے جو علم الکلام تیار اس پر افلاطون اور اس کے بعد نو افلاطونی مکتب فکر کا اثر بہت نمایاں تھا۔[21] عیسائی دانشوروں نے اپنے عقائد کی تشکیل، ان کی تشریح و تعبیر اور ان کے حق میں پیش کیے جانے والے کو یونانی فلسفے اور کونیاتی نظریات کو خاص نظر میں رکھا اور اسی کی روشنی میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کی علمی سعی کی۔ یونانی فلسفے کی مدد سے عیسائی متکلمین اپنے دین کا اثبات کیا کرتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے یونانی نظریات کو مذہب کی تشریح و توضیح اور حقانیت کے ثبوت کے لیے استعمال کیا تھا۔ مگر نشاۃِ ثانیہ کے دور میں جب یونانی فلسفے پر ضرب کاری کا آغاز ہوا تو ساتھ ہی عیسائیت پر بھی لوگوں کا ایمان متزلزل ہونا ناگزیر نتیجہ تھا۔

۶۔ کلیسا کے علماء کتبِ مقدسہ کی تفہیم کو اُس فکر کے تابع رکھنا چاہتے تھے جو ان کے پادریوں نے یونانی، یہودی اور رومی فکر سے اخذ کر کے مرتب کی تھی۔ ان کے ہاں موسوی شریعت کی اصل کے بجائے اس شریعت کی خود ساختہ تفہیم کو دین کا درجہ دے دیا گیا جس سے اختلاف ان کے نزدیک مذہب سے اختلاف تھا۔ مذہبی متون اپنی تحریف شدہ حالت میں بھی جس قدر آزادیٔ فکر فراہم کر رہے تھے، ان پر لگائے گئے

[21] مولف: ایڈون اے برٹ، فلسفہ مذہب، مترجم بشیر احمد ڈار، صفحہ ۹۷، مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۲۰۰۹،

حاشیوں نے اس آزادی پر قدغن لگادی۔ چنانچہ جب گلیلیو نے جب زمین کے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو عیسائی علماء کے نزدیک یہ بائیبل کے خلاف تھا۔ حالانکہ اصلاً یہ اس خود ساختہ تفہیم کے خلاف تھی جو حقیقتاً انسانی تحریفات کا نتیجہ تھیں۔ یہی وہ فکر تھی جس نے کلیسا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے فہم کے مخالف مفکرین کو کڑی سے کڑی سزائیں دیں۔ جان وینی، گلیلیو، کوپر نیکس اور برونو جیسے کئی اہل علم کو کلیسا کی جانب سے عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ علم و عقل کے علم بردار مفکرین جب ظلم کا شکار ہوئے تو یہ ظلم مذہب بیزاری کے رجحان پر منتج ہوا کیونکہ عملی طور پر ان کے سامنے یہ مثال واضح تھی کہ مذہب اور سائنس باہم متصادم ہے حالانکہ یہ تصادم اصل مذہب کے بجائے اس کی تفہیم سے متعلق تھا۔

۷۔ مذہب اور سائنس کے اختلافات پیدا ہوتے ہی مفکرین کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جس نے اس مخاصمت کا حل یہ پیش کیا کہ مذہب اور سائنس کو بالکل علیحدہ رکھا جائے۔ مثلاً فرانسس بیکن کا کہنا تھا کہ مذہب کی بات بھی مانو اور خدا کو بھی تسلیم کرو۔ چاہے ہماری عقل اس کو تسلیم نہ کرتی ہو اور خدائی قانون کی پابندی کرو خواہ ہمارا ضمیر اس کو بوجھ محسوس کرے۔[22] اس سیکولر نظریے نے مذہب اور سماجی علوم کو اس طرح علیحدہ کیا کہ اس صدی میں ایک سائنسی علوم کا ایک پورا ذخیرہ تیار ہوا جو بالکل بے خدا (Godless) تھا۔ اخلاقیات اور معیشت و معاشرت کے متعلق ایسے فلسفے پیش کیے

[22] مولانا امین احسن اصلاحی۔ **فلسفے کے بنیادی مسائل**۔ صفحہ ۶۹۔ فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۱۳

جس میں مذہب اور آسمانی ہدایت کو بالکل باہر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہر چیز حتیٰ کہ کائنات اور خود مذہب کے سرچشمے کی توجیہہ بھی مادی نقطہ نظر سے کی جانے لگی۔ اس بے خدا علوم کے ذخیرے نے علمی سطح پر الحادی فکر کی راہ ہموار کی اور الحاد کو نام نہاد سائنسی بنیادیں فراہم کیں۔

انفرادی نوعیت کی وجوہات سے قطع نظر یہ وہ بنیادی عوامل تھے جن کا تعلق براہ راست مذہبی طبقے سے تھا اور انہی عوامل نے مغرب میں الحاد کو پنپنے کا سماجی جواز فراہم کیا۔ غور کریں تو آج ہم بھی کم و بیش اسی رویے کو اپنائے ہوئے ہیں جس کا اظہار یہود اور عیسائی اقوام نے نشاۃِ ثانیہ سے قبل کے دور میں کیا۔ آج ہمارے ذہن بھی فرقہ واریت سے آلودہ ہیں، اور ہماری اخلاقی حالتِ زار بھی پوپ سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو تمام تر برائیوں کے باوجود اپنے تئیں خود کو پاک دامن اور متقی گردانتے تھے۔ دین کی تفہیم پر ہونے والی تنقید کو دینی انحراف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس بنیاد پر گستاخی، جدت پسندی اور کفر کے فتوے، حتیٰ کہ واجب القتل قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ مذہب و سیاست کی باہمی چپقلش آج بھی اسی طرح جاری ہے اور ہم نے بھی غیر متغیر کلامِ الٰہی کو ثابت کرنے کے ہر لحظہ بدلتی ہوئی سائنس کو معیار بنالیا ہے۔

یہ سب ہمارے لیے غور و فکر کا مقام ہے کہ اگر ہم نے بھی مذہبی و فکری اعتبار سے اسی طرح کا کردار ادا کیا جو اس دور میں کلیسا کا تھا، تو کوئی مانع ہیں کہ آئندہ کے حالات ہمارے لیے انتہائی مایوس کن ہوں گے۔

مذہب بیزاری کی وجوہات اور اس کے تدارک کی حکمت عملی

الحاد کے تدارک کی حکمتِ عملی کے ضمن میں ضروری ہے کہ لوگوں کو ایک ہی طرز پر دعوت دینے کے جائے ان کے مزاجوں اور طبائع کے فرق اور جدید ثقافتی و نفسیاتی رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متنوع طریقے سے انہیں مذہب کی طرف مائل کیا جائے۔اس سلسلے میں الحاد کی تاریخ دیکھنے کے بعد اگر ہم اسی تاریخ کے پس منظر میں الحاد کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کریں تو وہ حسب ذیل سامنے آتی ہیں۔

مذہبی و معاشرتی حالات

مذہب کی مخالفت کا ایک اہم عنصر سماجی ہوتا ہے۔ بعض لوگ جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں کے مذہبی حالات درست نہیں ہوتے۔ان میں غیر عقلی اور شدت پسندی کے رجحانات کو مذہبی تعلیمات میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مذہب ہی برا ہو بلکہ ممکن ہے مذہبی رہنماؤں کی جانب سے اس کی غلط تشریح و تفہیم کی گئی ہو۔اس کی وجہ سے انسان کلی طور پر ہر مذہب کو اسی مذہب کی طرح گمان کرتا ہے اور مذہب کا منکر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ کسی ایسے مذہب کا پیروکار ہو جو عقل و

فطرت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہو، ایسی صورت میں بھی بعض حضرات تمام مذاہب کو یکساں طور پر باطل مان لیتے ہیں۔

کچھ معاشروں میں مذہبی شدت پسندی یا پھر کوئی ایسا معاشرتی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذمہ دار کسی نہ کسی طرح مذہبی رہنما سمجھے جاتے ہیں مذہبی رہنماؤں کی اخلاقی حالت اس سلسلے میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر مذہبی رہنماؤں کی اخلاقی حالت مخدوش ہو تو بعض لوگ اسی بنیاد پر مذہب کے ہی مخالف ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ مذہب پر ایمان ہی سماجی مسائل اور حالات کی ذمہ دار ہے۔ عام طور پر اسی صورت میں سیکولرزم کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

سماجی و معاشرتی وجوہات کی بنیاد پر اور بالخصوص مذہبی رہنماؤں کے منفی کردار یا مذہب کی غیر عقلی اور شدت پسندانہ تعبیر کی بنیاد پر الحاد کی راہیں اختیار کرنے والوں کو مذہب کی جانب مائل کرنے کے لیے سب سے اولین ضرورت تو یہ ہے کہ اُن کے سامنے مذہب کی درست تفہیم و تشریح پیش کرنے کی کوشش کی جائے اسی کے ساتھ انہیں اس جانب متوجہ کیا جائے کہ چند بُرے لوگوں کے اعمال اور اُن کی بداخلاقی کسی مذہب یا پوری مذہبی فکر کی نمائندگی نہیں کرتی چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھے اور باکردار لوگ مذہب اور اہل مذہب کی نمائندگی کرنے کے لیے آگے آئیں اور انہیں اس بات پر قائل کیا جائے کہ وہ مذہب کی صحیح نمائندگی کے لیے بجائے مذہب سے بیزار

ہونے کے از خود بھی آگے بڑھ کر اس کی نمائندگی اپنے اچھے کردار اور اخلاق سے کر سکتے ہیں۔

شخصی وجوہات

نفس پرستی

بعض لوگوں میں مذہب سے ذاتی طور پر بیزاری پائی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور مذہب چونکہ کئی اخلاقی جرائم پر پابندی عائد کرتا ہے لہذاہ وہ مذہب کو اس سلسلے میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔اس ضمن میں مزید غور کیا جائے تو مزاج کا یہی عنصر عصر حاضر میں آزادانہ جنسی تعلقات سمیت کئی اخلاقی برائیوں مثلا "ہم جنس پرستی کی ایک وجہ ہے۔

ملحدین کے اس گروہ کی اصل ضرورت دین کی روحانی دعوت کا پیش کرنا ہے یعنی انہیں اسلام کے روحانی نظام سے نہ صرف علمی طور متعارف کرایا جائے بلکہ عملی ماحول سے جوڑنے اور صالحین کی صحبت کا اہتمام بھی کیا جائے جس کی بدولت ان کی شخصیت میں اخلاقی برائیوں سے بچنے کا حقیقی محرک پیدا کیا جاسکے۔

عقلی و نظریاتی وجوہات

الحاد کے فروغ میں نظریاتی عوامل کا بھی ایک اہم اور بہت بڑا کردار ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں دوسروں کی باتیں سن کر یا بعض نفسیاتی کمزوریوں کے سبب ازخود ہی شبہات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ جلد ہی نفسیاتی طور پر اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایسے لوگوں میں اگر تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہو یا پھر وہ کسی بناء پر تجزیہ کرنے کے عادی نہ ہوں تو ان کا ذہن اسی مناسبت سے کئی قسم کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور چونکہ وہ اپنی کنفیوژنز کا جواب نہیں تلاش کر پاتے تو وہ مذہب کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔

تجزیے کی صلاحیت سے محروم ایسے ہے لوگوں میں سے بعض جن کا میدان تخصص سائنس ہو وہ سائنسی مضامین کی مخصوص علمی اپروچ اور طرزِ استدلال کا مطالعہ کرتے ہوئے جب مذہب کی تعلیم اور سائنسی حقیقت میں مطابقت نہیں دیکھتے تو مذہب کی صداقت کے بارے میں ان کے دل کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔اکثر مذاہب میں موجود غیر عقلی عقائد بھی اس کی ایک اہم مثال ہیں جسے وہ عقل کے خلاف دیکھتے ہیں تو کلی طور پر تمام مذاہب کے ہی مخالف ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی حقیقی ضرورت اسلام کے عقائد اور افکار کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنا ہے، سائنس اور فزیکل سائنسز کی محدودیت، خلافِ عقل اور ماورائے عقل

امور میں فرق سمجھانا اور مذہب کے وجود کو فطرت و وجدان کی پکار کا جواب ثابت کرنا ہے۔

ہر آدمی ایک سی ذہنی استعداد کا حامل نہیں ہوتا چنانچہ مخاطب کی ذہنی استعداد اور علمی گہرائی کا ٹھیک سے اندازہ لگاتے ہوئے جوابات دیے جانے چاہئیں۔ مذہب اور سائنس دو الگ الگ میدان ہیں جہاں تمام ہی چیزوں کو ایک سے طرزِ استدلال پر ثابت نہیں کیا جاسکتا لہذا مذہب کے طرزِ استدلال کی گہرائیوں اور فکری بالیدگی کو درست طرز پر پیش کرنا یہاں اصل چیلنج ہے۔

موروثی الحاد

بعض لوگوں کے والدین ملحد ہوتے ہیں جن کی تربیت میں رہتے ہوئے بچے بھی ملحد بن جاتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہونے والا شخص ہندو ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ غور و فکر کے بعد مذہب تبدیل نہ کرلے۔

ملحدین کے اس گروہ کی اصل ضرورت دین کی مکمل دعوت اور اُن کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے اُن کے افکار کا علمی جواب مہیا کرنا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی فکر یا فلسفے کو اپنی زندگی میں سب سے اوّلین اہمیت دیتے ہوئے اُسی کی بنیاد پر اپنے اخلاقی وجود کی تعمیر کرتا ہے، چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس گروہ کے لوگوں کے افکار کا گہرا

علمی مطالعہ کیا جائے، فلسفہ وجدید علوم سے واقفیت حاصل کی جائے اور اُن کے اخلاقی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اُن تک خُدا کے دین کی دعوت پہنچائی جائے۔

ملحدین کو دعوتِ دین

ملحدین کو دعوت کی ضرورت واہمیت

جب انسانیت کے سرچشمے سوکھ جائیں، نگاہیں بھٹک جائیں اور قدم ڈگمگانے لگیں تو انسانیت نیکی و صلاح پر استقامت کھو بیٹھتی ہے، دین پر عمل کرنے کی استعداد ہمیشہ بقدرِ یقین اور بقدرِ ایمان ہوتی ہے۔ایمان جس قدر کمزور اور یقین جس قدر متزلزل ہو گا اُسی قدر دین پر چلنے اور دین کے مطابق زندگی کو ڈھالنے کی استعداد میں بھی کمی آتی رہے گی،اسی لیے اللہ ربُّ العزت نے انسانی حالات کے بارے میں اپنے کامل علم اور بے پایاں رحمت کے پیشِ نظر پے در پے انبیاء کرام بھیجے اور ہر نبی کو حالاتِ زمانہ کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی۔ تمام انبیاء انسانیت کے سوکھے چشموں کو پھر سے سیر اب کرتے لوگوں کو اپنی تخلیق کے مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دیتے اور اس مقصد کی یاددہانی کے لیے کارِ دعوت کو کماحقہ سرانجام دیتے۔

جب کبھی گزشتہ نبی کی محنت کے نقوش دھندلانے لگتے اور انسانیت گراوٹ کا شکار ہو جاتی اُس کی روحانی زندگی کی عمارت مخدوش ہو کر گرنے لگتی تو ایمان کی مردہ و بنجر زمین پر عالمِ بالا سے روح پرور جھونکوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا مالکِ کائنات

بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ دکھانے کے لیے ایک بار پھر پیغمبر کو مبعوث فرماتے جو بکھری ہوئی اور انحطاط کا شکار انسانیت کو اللہ کے پیغام کی طرف بلاتے اور اُن تک حق کا پیغام پہنچاتے۔ جنہوں نے اُن کی بات کو غور سے سن کر ان کی تعلیمات کی پیروی کی وہ انسانی کمالات کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔

یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا اور پیغمبرِ آخر الزماں جنابِ رسول اللہ ﷺ پر آکر اختتام پذیر ہوا۔ نبی ﷺ سے پہلے تک چونکہ خدائی ہدایت میں تحریف اور انسانی آمیزشوں کا سلسلہ رہا کرتا اور پیغمبر کے جانے کے بعد اُن کے پیروکار دین میں غلو اور بعض اوقات گمراہیوں کو دین کا حصہ بنا کر اُس میں تحریف کے مرتکب ہوتے چنانچہ آخری پیغمبر کی لائی ہوئی آخری ہدایت کو قرآن و سُنّت کی صورت میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ اب روزِ حشر تک ہدایت میں گمراہی کے گڈمڈ ہونے کا خدشہ چونکہ ختم ہو گیا لہٰذا پیغمبری کی ضرورت بھی باقی نہ رہی اور دعوتِ دین کے عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لئے مکمل اُمّت کو اُٹھا دیا گیا جس کی ذمہ داری دین پر عمل کرنا ہی نہیں بلکہ اسے دنیا تک پہنچانا بھی قرار دیا گیا۔

انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے راستے پر جو قدم بھی اٹھاتا ہے وہ اس کے لیے وراثتِ نبوت کے ثواب کا حقدار بن جاتا ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر انبیاء کا کام ہے لہٰذا اگر کوئی شخص اس مقصد کے لیے کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس نے متہم بالشان ذمہ داری قبول کر لی اور اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے

اسے یہ ذمہ داری سونپی ہے، بالفاظ دیگر ایسے شخص کو اُس کی نیت اور درجے کے مطابق اس ذمہ داری کا اجر و ثواب ملتا ہے۔

ہماری پیدائش کا مقصد ہی چونکہ اللہ کی معرفت حاصل کرنا اور دوسروں کے دلوں کو معرفتِ خداوندی کے نُور سے متعارف کرانا ہے چنانچہ جہاں ایک طرف داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ للّٰہیت اور تقویٰ شعاری کی صفات سے آراستہ ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مدعو کی ذہنی استعداد اور علمی و فکری صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف ہو اور جہاں ضرورت پڑے اُس کے علمی رد کو بھی بحُسن و خوبی انجام دے سکتا ہو۔

علمی رد سے ہماری مراد مناظرانہ بحث و مباحثہ نہیں بلکہ حکیمانہ طرزِ استدلال ہے جہاں آپ مخاطب کو اُس کی ذہنی کیفیت اور اُس کے معاشرتی اسٹیٹس کا لحاظ کرتے ہوئے اُسے دین کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیجیے کہ ملحدین کی غالب اکثریت عام طور سے انتہائی قابل اور پڑھے لکھے لوگوں کا گروہ ہے اور اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو مختلف مذاہب کی کتب اور اُن کے استدلال کا مطالعہ بھی کر چکے ہوتے ہیں چنانچہ ملحدین کو دعوتِ دین پہنچانے کے لیے دورِ جدید کے علوم سے اس قدر آگاہی ضروری ہے کہ داعی الحاد اور ملحد فلاسفہ کے علم و فکر اور استدلال کی بنیادوں کو بھی اچھی طرح سے سمجھنے کی صلاحیت سے آراستہ ہو۔

ایک اہم سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ملحدین اگر مذاہب کی کُتب کا مطالعہ کر کے اور مذہبی تعلیمات سے واقفیت کے باوجود مذہب سے متنفر اور متوحش ہو چکے ہیں تو انہیں دعوت دینا کیونکر مفید ہو سکتا ہے۔اس بات کا جواب یہ ہے کہ ملحدین کے مذہب سے متنفر و متوحش ہونے کی وجوہات اکثر حالات میں مذہب کا استدلال و علمی اختلاف کم اور مذہب پرستوں کی اخلاقی حالت اور شدت پسندی زیادہ ہے۔اگلے صفحات میں ہم الحاد کی طرف مائل ہونے کی وجوہات اور انہی کی بنیاد پر ملحدین کے مختلف گروہوں کو دعوت دین کی حکمت و طریقہ کار پر گفتگو کریں گے۔

مزید یہ کہ الحاد کی جانب رجحان رکھنے والوں میں چونکہ ذہانت اور قابلیت بھی ایک اہم قابل توجہ امر ہے چنانچہ ضرورت ہے کہ اس ذہین و باصلاحیت طبقے کو دین سے متعلق اشکالات اور کنفیوژنز کو دور کر کے دینِ متین کا سچا داعی بھی بنایا جاسکتا ہے۔کل تک جو ذہانت مذہب کی مخالفت میں استعمال ہو رہی تھی وہی ذہانت جب خُدا کے دین کے ابلاغ میں استعمال ہونا شروع ہو جائے تو سُرخ اونٹوں کی دولت سے زیادہ قیمتی ہونے کے مصداق کئی اندھے عقید تمندوں کی عقیدت سے بڑھ کر ہے۔

مزید یہ کہ ملحدین چونکہ مغربی علوم سے آراستہ اور مغربیت زہ سوچ کی بنیادوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لہٰذا ان کی دین میں واپسی دین کو دیگر بڑے طبقات تک پہنچانے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہو گی۔

ذرائع کا استعمال

دورِ حاضر میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا بالخصوص الحاد اور الحادی نظریات کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ اور سبب ہے۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد اب نہ صرف انٹرنیٹ کا استعمال بہت زیادہ کرتی ہے بلکہ سوشل میڈیا استعمال کرنے والوں کی تعداد بھی اب بلامبالغہ لاکھوں اور کروڑوں تک جا پہنچی ہے۔ ایسے میں دورِ جدید کے اس انتہائی اہم ذریعہ ابلاغ کے استعمال سے پہلو تہی کرنا کسی طور پر دانشمندی قرار نہیں دیا جاسکتا جب کہ بہت سے گمراہ کن عقائد وافکار کے حاملین اس کا بے دریغ استعمال کر کے اس کے ذریعے نوجوان نسل کے اذہان کو پراگندہ اور خیالات کو منتشر کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسی مناسبت سے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر اعلیٰ علمی و نظریاتی کام کی بنیادیں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے تادمِ تحریر اگرچہ بہت سے مخلصین انفرادی سطح پر اپنی اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق کام کر رہے ہیں تاہم الحاد کے مجموعی پھیلاؤ اور یلغار کے مقابلے میں ان کی محنت باوجود قابلِ قدر ہونے کے ناکافی اور بعض صورتوں میں غیر معیاری ہے۔

بڑے پیمانے پر لوگوں کی ذہن سازی کے سلسلے میں میڈیا کی طاقت سے دورِ حاضر میں کوئی انکار نہیں کر سکتا لہٰذا پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا پر اہل علم شخصیات کے لیکچرز اُن کے علمی سفر اور مذہب سے تعلق کی روداد بھی بہت سے ناواقف لوگوں کو مذہب کی جانب مائل کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

جذباتیت اور شدت پسندی سے پرہیز

مذاہب کی بھیڑ میں جو بات ہمارے دین کو دیگر مذاہب میں سب سے ممتاز کرتی ہے وہ درحقیقت اِس کی اعتدال پسندی اور فطری سادگی ہے۔ چنانچہ عام مسلمانوں کو اپنی داعیانہ ذمہ داریوں کے تناظر میں یہ سمجھنا لازم ہے کہ الحاد کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے اور کسی متاثرہ ذہن کے دین میں واپسی کا سفر حکیمانہ اسلوب، برداشت اور رواداری کے بغیر ممکن نہیں۔

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے حالات کا نزدیک سے جائزہ لیتا رہے اور اُس کی غلطیوں سے کشادہ دلی کا معاملہ کرے۔ داعی کسی بھی انسان کے ساتھ مروّت، دانش مندی اور فراست کا رویہ اختیار کرکے اپنے مخاطب کے دل میں جگہ بنالیتا ہے۔ دعوت بحث و مناظرے کا نام نہیں بلکہ اپنی بات کو مخاطب کی ذہنی سطح اور مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اُس کے لیے قابلِ قبول بنانے کا نام ہے۔

داعی مخاطبین کے حالات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور ہر ایسے اسلوب اور کام سے احتراز کرتا ہے جس سے اُس کے مخاطبین کے متنفر ہونے کا اندیشہ ہو۔ الحاد کی جانب جھکاؤ اور رجحان میں مذہبی طبقے کی غیر ضروری جذباتیت اور اشتعال انگیزی نمایاں وجوہات میں سے ایک ہے۔ داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے کام کی اہمیت پہچانتے ہوئے اپنے حالات و کردار کی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔ زرا سی ناگواری مخاطب کو اُن باتوں سے متنفر کرنے کا موجب بن سکتی ہے جنہیں حکمت و بصیرت سے پیش کرنا

داعی کی ذمہ داری تھی۔ اس سے بڑی نقصان کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہمارے اعمال و کردار کے نتیجے میں اُمّت کو ہونے والے نقصان کے ذمہ دار ہم بھی ہوں اور آخرت میں اس کی جوابدہی کرنی پڑ جائے۔

بحث ومباحثے سے عمومی احتراز

دعوت دین کی راہ میں لوگوں سے بحث و مناظرہ دعوت کے کام لیے سب سے نقصان دہ چیز ہے۔ داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ مکالمے کی فضاء کو جھگڑے و نزاع سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرڈالے کیونکہ جھگڑا و نزاع کی صورت میں اناپرستی دین کے پیغام کو مخاطب کے دل میں اُتارنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بحث وجدال کی فضاء میں درست بات تک رسائی ممکن نہیں رہتی اور گفتگو کی لگام شیطان کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم اپنی بات چاہے جتنی بھی موثر اور مؤدب انداز میں کیوں نہ پیش کریں مخاطب اس کے اثر سے بے اثر ہی رہے گا۔

غیر ضروری مباحثے اور مناظرے کی صورت حال میں دونوں فریقین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور مخاطب کو زیر کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں دعوت کا کام پیچھے چلا جاتا ہے اور اناؤں کی تسکین آگے آجاتی ہے۔

اخلاقی کردار

الحاد کے تدارک اور اس سے نمٹنے کے سلسلے میں ایک اہم بات جو ذہن میں

رہنی چاہیے وہ یہ بھی ہے کہ آج کا انسان اور بالخصوص نئی نسل مذہب سے متعلق محض ذہنی انتشار ہی کا شکار نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی خالی پن کا شکار ہے۔ چنانچہ محض عقلی بنیادوں پر مذہب کی حقانیت ثابت کرنا اور سوالات کے لفظی جوابات پیش کرنا مسئلے کا ادھورا حل ہیں تاوقتیکہ خدا سے روحانی تعلق کی زندہ مثال نہ پیش کی جائے۔

ذہنی انتشار Tip of Iceberg کی مصداق نفسیاتی و روحانی الجھنوں کی تہہ در تہہ اندھیریوں کا صرف ایک ظاہرہ ہے۔ اصل بیماری رُوح کا خالی پن اور اُس کا بیمار ہو جانا ہے۔ ایمان کے قائم رہنے کا تمام تر رستہ ذہنی انتشار کی گھاٹیوں سے گزر کر اصلاً "تعلق مع اللہ کی حلاوت کا متقاضی و محتاج ہے۔ الحاد سے ایمان کا یہ سفر جب تک قلبی حلاوت و لذتِ یقین کی وادی تک نہیں پہنچتا، انتشار در انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ الحاد اپنی بنیادوں میں روحانی دیوالیہ پن کی انتہائی شکل ہے اور روحانیات کے باب میں آج سب سے اہم کام لفظی جوابات نہیں حقیقی اور شخصی وجود پیدا کرنا ہے، جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آئے، جن کی شخصیت سچائی اور دیانت کی زندہ مثال ہو، جن کا وجود ہی بُرہان کی صورت خُدا کے وجود کی زندہ دلیل بن جائے۔

عوام الناس کی ذمہ داری

قرآنِ مجید نے اُمّتِ مسلمہ کی تعریف، پہچان اور مقصد کو صرف دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے یعنی امر بالا معروف اور نہی عن المنکر۔ گویا اُمّتِ مسلمہ ایک تعمیری، مثبت اور متحرک جماعت کا نام ہے جس کی ذمہ داری خُدا کے بے آمیز دین کی دعوت کو ساری دنیا میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق عام کرنا اور لوگوں تک خُدا کے پیغام کو پہنچانے کے لیے حتی الوسع کوشش کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف محض زبان سے کلمہ حق ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ خود اپنے طرزِ عمل میں معروف کو اختیار کرنا اس کے لیے شرطِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی کے ساتھ دین اور دینی علوم سے اس درجہ مناسبت رکھنا ہے کہ وہ اپنی دنیا کو اس طرز پر سنوار سکیں کہ اُن کی آخرت کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ یہ گویا دو طرفہ ذمہ داری ہے جس میں ہر فرد نے اپنی زات پر بھی اللہ کے دین کو نافذ کرنا ہے اور دوسروں تک بھی اس کے پیغام کی پُرامن دعوت پہنچانی ہے۔

الحاد کے تناظر میں یہ ذمہ داری مزید دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ مغربی تہذیب پوری شدت اور فکری یلغار کے ساتھ ہمارے گھروں اور تعلیمی اداروں میں داخل ہو چکی ہے جس کا سامنا آج ہر دوسرے شخص کو رہنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں عام

مسلمانوں کو اخلاقی رزائل اور بے روح دین داری سے بچنے کی ضرورت ہے وہیں دینی علوم سے بھی اس حد تک واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے کہ جدید فکری چیلنجز سے نمٹنے کی استطاعت پیدا ہو سکے۔

قرآن سے تعلق

اِس اُمّت کے ساتھ یوں تو سانحات بہت سے پیش آئے لیکن جس سانحے کو بلاشبہ سانحہ عظیم کہا جاسکتا ہے وہ قرآن سے زندہ اور حقیقی تعلق کا خاتمہ ہے۔ قرآنِ مجید ہدایت کی کتاب ہے اور ہدایت کے حصول کے لیے لازم ہے کہ اِسے سمجھ کر پڑھا جائے۔ آج اُمت کی ایک کثیر تعداد قرآن کی تلاوت کے نام پر محض الفاظ کی تکرار کو قرآن کا پڑھنا سمجھتی ہے۔ اِس سے چونکہ قرآن سے حقیقی تعلق نہیں استوار ہوتا لہٰذا قرآن جن روحانی بیماریوں کا علاج ہے اُن کے تدارک کی بھی کوئی سبیل نہیں بن پاتی۔

قرآن فہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ عربی زبان سے نابلد ہونا ہے عام مسلمانوں کو بالخصوص یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ قرآنی عربی سیکھنا اب کوئی مشکل مسئلہ نہیں رہا اس وقت پورے ملک میں قرآنی عربی کے شارٹ کورسز آسان انداز میں سکھانے کا بھرپور انتظام مختلف مکاتب فکر کے علماء کی جانب سے کیا جارہا ہے جن سے استفادہ نا کرنا کفران نعمت ہے۔ مزید یہ کہ اردو داں طبقے کے لیے تو عربی سیکھنا اس لیے بھی آسان ہے کہ اردو کے کئی ایسے الفاظ جو ہم روز مرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں وہ عربی میں بھی مستعمل ہونے کی وجہ سے عربی کا سیکھنا اردو سمجھنے والوں کے نہایت آسان ہے۔

مغربی تہذیب سے مرعوبیت

بعض لوگ مغربی ممالک کی مادہ پرستانہ تہذیب کی کامیابی اور مادی ترقی سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ مغرب سے آنے والے تمام افکار کو سینے سے لگانا کامیابی کی کلید سمجھ لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو جو بات سمجھانا سب سے اوّلین ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ سب سے پہلے تو مغرب میں اہلِ مذہب کی ناکامیوں کی وجوہات کا مطالعہ کریں مزید یہ کہ مذہب مغربی ممالک میں حکومت و سرکاری معاملات سے نکل جانے کے باوجود بھی بڑے بڑے سائنسدانوں اور مفکرین کی ذاتی زندگیوں میں پوری آب وتاب سے موجود رہا ہے۔یعنی سیاسی شکست کے باوجود مذہب اور مذہبی عقائد وہاں کے لوگوں میں بالعموم موجود ہیں۔

مغرب کی وہ بڑی شخصیات جن کے علمی کارناموں کے سبب مغرب نے ترقی کی ان کی اکثریت مذہب کے ماننے والوں کی ہے جن میں سے نمایاں نام البرٹ آئن اسٹائن، آئزک نیوٹن اور چارلس ڈارون وغیرہ ہیں۔اسی طرح مغرب میں جن سماجی و سائنسی علوم کو بام عروج حاصل ہوا اُن کی بنیاد مسلمان یعنی مذہب پسند اہلِ علم نے رکھی۔مثال کے طور پر جابرابن الحیان بابائے کیمیاء، ابن خلدون بابائے سماجیات، ابوالقاسم زہراوی جدید سرجری کے بانی، الخوارزمی جدیدالجبراء کے بانی کہلاتے ہیں

وغیرہ ایسے بہت سے نام ہیں جنہوں نے بے شمار علمی کارنامے انجام دیے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی لوگ بھی تھے۔

چنانچہ مذہب اگر سائنسی و مادی ترقی کے خلاف ہوتا تو یہ تمام تر علمی شخصیات مذہب کے ماننے والی نہ ہوتی۔

سوشل میڈیا پر گستاخانہ مواد اور ہمارا ردعمل

اکیسوی صدی کی اس دہائی کو اگر انٹرنیٹ کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔انٹرنیٹ دنیا کے بیشتر خطوں میں ہر خاص و عام کی رسائی میں ہے ، بالخصوص سوشل میڈیا کے تصور نے انٹرنیٹ کو حقیقتاً ایک گلوبل ولیج بنادیا ہے۔ فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ اور دیگر سہولیات کی بدولت آپ جو کچھ چاہیں محض ایک کلک کے ذریعے چشم زدن میں دنیا بھر تک پہنچا سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے آج جدید تہذیب میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ آزادی اظہار رائے کے مواقع حاصل ہو چکے ہیں۔ ہر شخص اس بارے میں آزاد ہو چکا ہے کہ وہ کسی بھی مذہب یا مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو، سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ کرے۔ لوگوں نے بے شمار اسلامی اور سوشل pages بنا رکھے ہیں جہاں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مختلف تصاویر و مواد پوسٹ کرتے رہتے ہیں۔ یہ آزادی یقیناً ایک خوش آئند بات ہے مگر اس مثبت پہلو کے ساتھ ہی سوشل میڈیا کے چند منفی پہلو بھی ہیں۔

سوشل میڈیا پر جس طرح اچھے لوگوں کو آزادی حاصل ہے جو اخلاقی ضابطے میں رہتے ہوئے اظہار رائے کرتے ہیں، اسی طرح منفی ذہنیت کے لوگوں کو بھی آزادی حاصل ہے جو خود کو کسی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں سمجھتے۔انھی لوگوں میں ایک بڑی تعداد وہ بھی ہے جو مذہب سے متعلق گستاخانہ اور ملحدانہ مواد شئیر کرتے ہیں۔ان پیجز کا مقصد مذہب کے خلاف مختلف شکوک و شبہات پھیلانا اور اہل مذہب کے جذبات مجروح کرنا ہوتا ہے۔ان لوگوں کا مشن ہوتا ہے کہ ایسے قابل اعتراض مواد کو اتنا پھیلایا جائے کہ وہ سوشل میڈیا کی زینت بن جائے اور ہر خاص و عام کی نظر سے گزرے۔یہاں ہمارا موضوعِ بحث ان کا گستاخانہ مواد نہیں بلکہ بحیثیت مسلمان اس پر ہمارا رد عمل ہے۔ان گستاخانہ پیجز کے متعلق ہم کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور ہمیں کون سا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

عام مشاہدہ ہے کہ ہمارے سامنے جب بھی ایسا مواد آتا ہے تو ایک شدت ایمانی کی وجہ سے ہم کبھی بھی خاموش رہنا گوارا نہیں کرتے۔کبھی ہم اس پر دھمکی آمیز تبصرہ کرتے ہیں تو کبھی اپنے دین و عقیدے کے دفاع میں آستینیں چڑھا کر جواب دینے لگ جاتے ہیں۔اکثر لوگ اس پر ایسے عجیب و غریب جواب بھی دیتے ہیں جو مخالف کا منہ بند کرانے کے بجائے اپنے ہی علمی زوال کی مثال پیش کرتے ہیں۔ذاتی مشاہدہ تو یہ بھی ہے کہ اس مواد سے متعلق اگر کوئی علمی جواب نہیں بن پاتا تو کم از کم پوسٹ کرنے والے پر لعنت کرنا ہی اپنے ایمان کا ادنی ترین فریضہ سمجھا جاتا ہے۔مگر ہمارا یہ رد عمل دراصل انھی کے فائدہ میں ہوتا ہے۔ایک جانب ہم لعن طعن سے اہل مذہب کے

بارے مین بدتہذیب ہونے کے پروپیگنڈہ کو تقویت دیتے ہیں تو دوسری جانب ہمارے تبصرے کی وجہ سے وہ مواد ہماری لسٹ میں موجود ہر ایک شخص کی نظر تک پہنچ جاتا ہے۔

انٹرنیٹ کی دنیا سے ہٹ کر ہمارے سامنے اس کی واضح مثال ملعون سلمان رشدی کی کتاب ہے۔جب اس شخص نے گستاخانہ کتاب Satanic Verses لکھی، تو بہت سے غیر مسلم ادبی نقادوں نے ہی اسے تیسرے درجے کا گھٹیا سا ناول قرار دیا اور اس کی کوئی شہرت نہ تھی۔ یہ بالکل اسی قسم کا تھرڈ کلاس ناول تھا جیسا کہ چھوٹے موٹے لکھاری لکھ مارتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کے متعلق ہمارا جو رد عمل آیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تھرڈ کلاس ناول دنیا بھر میں مشہور ہو گیا اور بیسٹ سیلر بن گیا۔ رشدی جیسا گھٹیا ذہنیت والا دنیا کا بڑا رائٹر بن گیا اور مغرب کے بعض متعصب لیڈروں کی وجہ سے اسے ''سر'' کا خطاب بھی مل گیا۔

ہم آپ سے ہر گز یہ نہیں کہہ رہے کہ آپ اس مواد سے متعلق اپنی آنکھیں بند کر لیں، بلکہ صحیح حکمت عملی کے ساتھ وہ کام کیجیے جو ان کے مذموم مقاصد کے بھی خلاف ہو اور اس سے انکو کسی بھی سطح پر کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ایک معروف مصنف کے الفاظ میں جیسے تاریکی کو ختم کرنے کے لیے چراغ جلایا جاتا ہے، ویسے ہی ان شیاطین کی خرافات کا جواب ہم چراغ جلا کر دے سکتے ہیں۔ صبر و ضبط، حکمت اور ہوش سے لیتے ہوئے ان کے مقاصد کو ناکام بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس حوالے سے چند اہم تجاویز ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

- گستاخانہ مواد پر خود سے سرچ کر کے نہ جائیے۔اس سے انٹرنیٹ پر ان کے پیجز کی ریٹنگ بڑھ جاتی ہے اور ساتھ ہی ان کا مواد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے لگتا ہے۔
- ایسے گستاخانہ مواد پر کوئی تبصرہ (Comment) بالکل نہ کیجیے۔کیونکہ جب بھی ایسے مواد پر جوابی کمنٹ دیا جاتا ہے تو وہ مواد مزید وسعت اختیار کر لیتا ہے اور ان پیجز کے مذموم مقاصد میں آپ لاشعوری طور پر اس کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں۔
- بحیثیت مسلمان دھمکی آمیز کلمات، یا گالیاں دینے سے گریز کریں۔
- اگر آپ پوسٹ میں موجود کسی اعتراض کا علمی جواب دینا چاہتے ہیں تو اُس گستاخانہ مواد پر مبنی پوسٹ کو شئیر کیے بغیر سوال و جواب بنا کر اپنی وال یا مختلف گروپس میں شئیر کریں۔وہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ آپ اُس کا مدلل جواب دے سکتے ہوں بصورتِ دیگر کسی صاحبِ علم سے جواب جان کر پوسٹ کریں۔
- فوری طور پر پیج کو رپورٹ کریں۔فیس بک انتظامیہ کسی بھی پیج کے بارے میں معقول تعداد میں رپورٹس موصول ہونے پر اسے بند کر دیتی ہے۔

- اگر آپ دیکھیں کہ پوسٹ کی وجہ سے کسی کے ذہن میں شکوک پیدا ہوئے ہیں تو اسے پرائیوٹ میسج میں جواب دے دیں۔ بشرطیکہ آپ کو جواب معلوم ہو۔
- اگر پوسٹ کی وجہ سے آپ دین یا کسی بھی حوالے سے شکوک و شبہات کا شکار ہوئے ہیں تو اہل علم سے رابطہ کریں۔

میں خدا پر کیوں یقین رکھتا ہوں؟

تحریر: حافظ محمد شارق (2006)

برٹرینڈ رسل اپنے دور کا سب سے بڑا ملحد فلسفی تھا، اس کا مشہور کتابچہ Why I am Not a Christian آج بھی ملحدین کے ہاں انتہائی معتبر سمجھا جاتا ہے، اکثر ملحدین خدا اور مذہب کے خلاف جو مقدمہ پیش کرتے ہیں، جن طریقوں سے مذہبی استدلال کا جواب دیتے ہیں وہ سب انھی تحریروں سے ہی ماخوذ ہوتا ہے، اس لحاظ سے Why I am Not a Christian کو الحاد کا مینی فیسٹو کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ میری نظر سے یہ کتابچہ اس وقت گزرا جب میں تشکیک کی راہ سے نکل کر ایمان کے گلشن میں قدم رکھ رہا تھا۔ یہ غالبا 2006 کی بات ہے جب انٹرنیٹ کیفے سے یہ کتاب ڈاؤن لوڈ کی اور اس کا مطالعہ کیا۔ رسل کی یہ تصنیف میرے لیے اس لحاظ سے بہت اہم رہی کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی مجھے اس بات پر قطعی یقین حاصل ہو گیا کہ الحاد کا مقدمہ انتہائی کمزور اور مغالطہ آمیز ہے۔ حسب عادت مطالعے کے دوران اپنی ڈائری میں کچھ تبصرے بھی لکھتا رہا۔ یہ تحریر دراصل انھی تبصرے کی مرتب صورت ہے۔

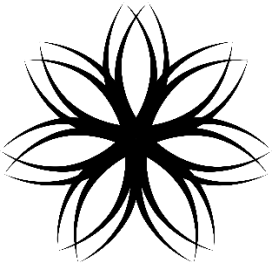

اس سے قبل کہ میں یہ کہوں کہ مذہب کے بارے میں میرا نظریہ کیا ہے اور کس طرح مذہب مثبت طور پر میری زندگی کو متاثر کرتا ہے، بہتر ہوگا کہ میں پہلے یہ وضاحت کردوں کہ میرے نزدیک ہر وہ شخص مذہبی ہے جو خدا اور روزِ آخرت کا اقرار کرتا ہو۔ میں ابھی مسلمانیت کی بات کر رہا ہوں نہ ہی کسی اور مذہبی عنوان کی۔ میں خالصتاً اصولی بنیادوں پر مذہب کی بات کر رہا ہوں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور (جو) نصاریٰ اور صابی (تھے ان میں سے) جو (بھی) اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کئے، تو ان کے لئے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ (سورہ البقرۃ۔ آیت 62)

ویسے ہر ایک مذہب، بلکہ ہر ایک انسان کا تصورِ خدا بالکل جُدا ہے، اور ہر ایک مذہب بھی یومِ آخرت کا اپنا مختلف تصور رکھتا ہے، لیکن جزوی تفصیل کو چھیڑے بغیر میں اس بات کو درست سمجھتا ہوں کہ ان دو باتوں پر ایمان کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ انسان اس زندگی میں خدا کی معیت کا احساس رکھے اور ایک بھرپور اخلاقی زندگی بسر کرے، اسے اپنے ہر ایک عمل کے لیے جوابدہی کا یقین کا ہو۔ اگر کوئی شخص ان دونوں باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو ان دونوں کے تقاضوں کے سنجیدگی سے پورے کرنی کی سعی کرتا ہو تو اسے مذہب کے دائرے میں داخل کر دینا چاہیے۔ خدا اور یومِ آخرت کے انکاری کو ہم مذہب پسند نہیں مان سکتے۔ اگر کوئی شخص خود کو مذہبی کہلوانا پسند کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ ان دونوں چیزوں پر ایمان لے آئے۔

بحیثیت متلاشی حق جب میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے خدا اور مذہب کو ایک شعوری دریافت کے طور پر تسلیم کیا ہے اور میں ایک خدا پرست انسان ہوں، تو لازم ہے کہ میں وضاحت بھی کروں کہ کیوں میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔

خدا

خدا کے وجود کے لیے اگرچہ سینکڑوں دلائل دیے جا سکتے ہیں، دلائل کا ایک طومار ہے جسے کھول دیا جائے تو ضخیم کتاب بن جائے، لیکن میں اپنی اور قارئین کی سہولت کی خاطر مختصر طور پر یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ وہ کون سے عقلی و سائنسی دلائل ہیں جن کی بنیاد پر مجھے خدا کے ہونے پر یقین ہے۔

سب سے زیادہ سادہ اور آسانی سے سمجھ آنے والی دلیل اس کائنات کی تخلیق ہے۔ ہر وہ چیز جو موجود ہے اس کا کوئی نہ کوئی خالق لازم ہوتی ہے۔ یہ کائنات کا سادہ سا قانون ہے۔ ہر معلول کے پیچھے علت ہونا ضروری ہے۔ اگر کائنات موجود ہے، ہم اس کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور ہم اس کے وجود پر یقین بھی رکھتے ہیں تو لازمی ماننا پڑے گا کہ اس کا کوئی خالق بھی ہوگا۔ یہ کائنات بڑے ہی منظم انداز سے پیدا ہوئی ہے۔ توانائی کا ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ تھا جس میں عظیم انفجار (Big bang) کے بعد یہ کائنات پیدا ہوئی اور سب چاند، ستارے، سورج، کڑوڑہا کہکشائیں اور کائنات عالمِ نمود میں آئی۔ یہ محض اتفاق سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ ریاضی کا سادہ سا اصولِ امکان (Law of Probability) ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی تخلیق اتفاقی طور پر کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ جب یہ اتفاق نہیں تو پھر یہ ماننا چاہیے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ کیا ہم شیکسپیئر کے ڈرامے یا غالب کی بہترین غزلیں پڑھ کر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کسی گودام میں جہاں کاغذ اور سیاہی رکھی تھی، ایک دھماکے کے بعد سیاہی پھیل گئی اور یہ کتابیں تیار ہوگئی؟

کیا ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہوائی جہاز کبھی اتفاق سے نہیں بنتا، مگر مکھی اتفاقاً مادے سے بن گئی۔ گاڑی کبھی اتفاق سے ایجاد نہیں ہوئی مگر یہ حیوانات اتفاقاً پیدا ہوگئے۔ ایک بے شعور روبوٹ کبھی خود سے اتفاقاً پیدا نہیں ہوا مگر یہ باشعور انسان اتفاقاً مادے سے پیدا ہوگیا۔۔۔۔ یہ دعویٰ ہماری عقل و شعور کی بدقسمتی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

یاد پڑتا ہے کہ میرا ایک ملحد سے مکالمہ ہوا۔

صاحب کہنے لگے کہ یہ دلیل اب بالکل بے کار ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ کائنات کا خالق ہے تو اگلے لمحے پھر ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ خالق کائنات کا خالق کون ہے؟

میں نے کہا کہ کائنات کے ہر ایک مظہر کے پیچھے ایک محرک ہے اور اس کے پیچھے ایک اور محرک۔۔۔ یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے حتیٰ کہ ہم عقلی تقاضے سے اس ہستی تک پہنچ جاتے ہیں جو واجب الوجود ہے اور اس کا کوئی محرک نہیں۔ سائنس دان بھی یہی بات مادے کے بارے میں کہتے ہیں کہ کائنات کے پیچھے توانائی ہے اور اس توانائی کے پیچھے ایک اور توانائی۔۔۔ فرق بس یہ ہے کہ ہم علت اولیٰ کو صاحب صفات خدا مانتے ہیں جس نے پورے اہتمام کے ساتھ یہ کائنات تخلیق کی اور آپ کہتے ہیں کہ نہیں، یہ کائنات خود سے آگئی۔ یعنی آپ خود تو بے شعور کائنات کو بغیر خالق کے ماننے کو تیار، اور ہم سے خالق کے خالق کا مطالبہ ہے؟ اور پھر مزید میں نے بھی یہ کہا ہے کہ کائنات میں ہر شے کی علت ہے، کائنات سے باہر بھی علت کا یہ قانون قابل اطلاق ہے، کسے معلوم ہے؟

آپ ہم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہر شے کا خالق ہے تو پھر خدا کا خالق کون ہے، خدا خود بخود کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر آپ کیوں جواب نہیں دیتے کہ اگر اس ''خود بخود

'' کے اعتراض کی وجہ سے خدا کا وجود معدوم ماننے پر اصرار کرتے ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ کائنات پر یہ اعتراض نہیں ہوتا؟ کائنات ''خود بخود'' کیسے آ گئی؟

رسل نے بھی اس دلیل کے بارے میں اپنی مشہور کتاب ''میں عیسائی کیوں نہیں'' میں لکھا ہے کہ:

''ایک ہندو کہے کہ دنیا ہاتھی کے سر پر کھڑی ہے اور ہاتھی کچھوے پر کھڑا ہے اور جب کوئی پوچھے کہ ''کچھوا کس پر کھڑا ہے؟'' تو وہ جواب دے کہ ''چلو کسی اور موضوع پر بات کریں۔''

مگر کاش کہ رسل سے کہا جاتا ہے وہ سائنس دانوں سے پوچھے کہ کائنات کہاں واقع ہے؟ اگر کسی اور کائنات کے اندر واقع ہے تو پھر وہ بڑی کائنات (Mega Universe) کس میں واقع ہے؟ اُس کے باہر کیا ہے اور پھر اُس کے مزید باہر کیا ہے؟

رسل یہ اعتراض کرتے ہوئے ایک سادہ سی حقیقت بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ ہر کائنات، ہر سیارے، ہر کہکشاں کا ایک اپنا نظام اپنا قانون ہوا کرتا ہے۔ نیوٹن درخت کے نیچے بیٹھا تھا تو اس کے سر پر سیب آ گرا تھا اور اس نے دریافت کر لیا کہ یہاں کششِ ثقل موجود ہے، مگر وہ چاند پر ہوتا تو شاید اس کا سر اس سیب سے محفوظ رہتا اور وہ کبھی کششِ ثقل پر ایمان نہ لاتا۔

جب ہم خالق کائنات کی بات کرتے ہیں تو خدا اس کائنات کی قوانین کی زد میں نہیں آتا۔ علت و معلول کا قانون کائنات کے لیے ہے نہ کہ اس قانون کے خالق کے لیے۔

علامہ اقبالؒ نے بھی علت و معلول کی کونیاتی یا علتی دلیل پر شدید تنقید کی ہے۔ ان کی تنقید کی محور یہ ہے کہ کیونکہ علت و معلول برابر طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اس لیے یہ دلیل ذاتِ الٰہی کی تحدید اور واجب الوجود کی نفی کرتی ہے۔ مگر ہم یہی بات کہتے ہیں کہ ہم آخر کیوں خدا کو محض ایک ''علت'' متصور کرتے ہیں؟ کیا خدا کے لیے ممکن نہیں کہ اس کائنات سے ماورا رہتے ہوئے عالمِ نمود میں کوئی علتِ اولیٰ تخلیق کرے؟

قوانین فطرت

جدید زمانے کے سائنس دان تخلیق کائنات کے بارے میں جو جتنے بھی نظریات پیش کر چکے ہیں، ان سب میں یہ نکتہ متفق علیہ ہے کہ یہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے۔ ایک مخصوص لمحہ تھا جب یہ کائنات وجود میں آئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ نہ مادہ تھا، نہ توانائی تھی، محض قانون تھے تو پھر یہ قانون کہاں سے بنے؟

چونکہ فطرت اپنے اندر کچھ قوانین رکھتی ہے، جو انسان نے تخلیق نہیں کیے، اور یہ قوانین بھی ایسے ہیں کہ ان میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، اس لیے ضروری ہے کہ

فطرت میں ان قوانین کو ودیعت کرنے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ آخر کون ہے جس نے کائنات کو ان قوانین کی پیروی کا حکم دے رکھا ہے؟

ارسطو اور نیوٹن

ایک ملحد سے مکالمہ ہوا۔ موصوف کمسٹری کے پروفیسر تھے۔ خدا کی اس دلیل کے بارے میں فرمانے لگے کہ خدا کے بارے میں ارسطو کا استدلال بڑا مشہور ہے کہ مادہ میں حرکت ہے اور چونکہ حرکت کے لیے قوت محرکہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح طویل سلسلے کے بعد ہمیں منطقی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخر کار ہر حرکت کے پیچھے ایک عظیم قوت محرکہ موجود ہے جو خدا ہے جس نے کائنات کو حرکت دی ہے۔ مگر ارسطو کا استدلال نیوٹن کی فزکس کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ نیوٹن کے قانون کے مطابق حرکت بھی مادہ کی فطری حالت (Natural State) ہے۔ چنانچہ اب ضروری نہیں کہ مادہ میں حرکت کی توجیہہ کے لیے کسی خدا کو لازم قرار دیا جائے۔

نیوٹن سائنس دانوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے، اس کا بیان کردہ قانون کوئی معمولی بات نہیں، اس لیے ان کی یہ دلیل مجھے بھی بڑی اہم معلوم ہوئی، بچپن میں پڑھی سائنس بھی دوبارہ یاد کرنے لگے۔ پہلا قانون تو حرکت کا مادہ کی صفت ثابت کرتا ہے، یعنی کائنات کی حرکت کے لیے کسی محرک کی ضرورت نہیں؟

بظاہر یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ اب مادے کی حرکت کے پیچھے ہم خدا کو براہ راست کارفرما نہیں دیکھ سکتے۔ مگر نیوٹن کا اگلا ہی قانون خدا کے اثبات کو اسی جگہ کھڑا کر دیتا ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ نیوٹن کا دوسرے قانون کا پہلا حصہ یہ ہے کہ کسی جسم میں پیدا شدہ اسراع (Acceleration) اس پر عامل قوت (Force) کے تناسب سے ہوتی ہے، نیوٹن کی مکمل مساوات (Equation) یوں ہے: F = ma۔

اس دوسرے قانون سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر حرکت میں Acceleration یعنی اسراع ہو گی تو اس کا تعلق براہ راست کسی نہ کسی فورس سے بھی ہو گا۔ اب آپ اس قانون کی روشنی میں کائنات کو دیکھیں۔ جدید سائنس بتاتی ہے کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ اس میں کہکشاؤں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔

جدید سائنس کائنات کے بارے میں متفق ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے، اور وسعت پذیری کی رفتار یکساں نہیں ہے بلکہ بڑھ رہی ہے، یعنی اس میں Acceleration موجود ہے۔ لہٰذا نیوٹن کے دوسرے قانون کی رُو سے کائنات میں کے پھیلاؤ میں چونکہ Acceleration ہے اس لیے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی فورس موجود ہونی ہے۔ اسی لیے آج ماڈرن فزکس نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ اس عمل کے پیچھے ڈارک انرجی موجود ہے۔ یہ ڈارک انرجی کیا ہے؟ سائنس اس بارے میں نہیں جانتی کہ یہ ڈارک انرجی کیا ہے لیکن وہ مجبور ہے کہ وہ اس اَن دیکھی فورس کو تسلیم کرے۔

سائنس یہاں آکر رُک جاتی ہے کہ مگر ہم کہتے ہیں کہ اگر ڈارک انرجی ہے تو پھر اس قوت کو حیات بخشنے والی کوئی نہ کوئی ذات ہونی چاہیے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

بہر حال یہ کائنات ہی اپنی تخلیق میں خدا کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور اس دلیل پر ہونے والے اعتراضات اتنے سطحی ہیں کہ فی الحال اس مختصر تحریر میں ان کے جوابات میں بھی وقت ضایع نہیں کرنا چاہیے۔

بے صفت خدا؟

ایک نئی فکر جس کے دامن میں اب اکثر ملحدین پناہ لیتے ہیں وہ ڈیزم ہے۔ جب سائنس اور منطق نے الحاد کی فکری بنیاد کو ڈھا دیا، اور عقل و شعور کے حامل کسی بھی فرد کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ دلائل کے میدان میں کائنات کے خالق کا انکار کرے، تو راہِ فرار یہ اختیار کی گئی کہ خدا کے وجود کے انکار کے بجائے اس کی فرمانروائی اور کائنات میں اس کی دخل اندازی کا انکار کر دیا جائے، اور اس کے لیے لا محالہ طور پر انھیں خدا کی صفات کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہ خدا کو خالق کو تسلیم کرتے لیکن دیگر صفات کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا کو خالق تسلیم کر لینے کے بعد دیگر بہت سی صفات از خود لازم ہو جاتی ہیں۔

عام سا مشاہدہ ہے کہ ہم کوئی بھی شاہکار اسی وقت تخلیق کرتے ہیں جب ہمیں اس کا علم ہو۔ کیا کائنات کا یہ تنوع اور تخلیق کے بے کراں سلسلہ بغیر علم کے تخلیق کر دیا گیا ہے؟

خدا نے کائنات کی تخلیق کی تو کیا خدا علم نہیں رکھتا؟ یقیناً اس کا جواب اثبات میں ہے کہ خدا علم رکھتا ہے۔ تو پھر خدا ''علیم'' بھی ہے!

آپ بھی کوئی کام کرتے ہیں تو کسی مقصد کے پیش نظر کرتے ہیں خدا نے بھی یہ کائنات محض تماشا رچانے کے لیے نہیں بنائی بلکہ ایک مقصد سے بنائی ہے۔ آپ اس مقصد کو دریافت کریں یا نہ کریں، آپ اس پر ایمان لائیں یا نہ لائیں لیکن یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ خدا نے ایک بامقصد تخلیق کی ہے تو وہ حکیم بھی ہے! خدا نے کائنات تخلیق تو کیا وہ اس تخلیق پر قدرت نہیں رکھتا تھا؟ تخلیق پر قدرت رکھتا تبھی تو یہ تخلیق موجود ہے۔ گویا خدا ''قادر'' یعنی صاحب قدرت اور صاحب اختیار بھی ہے! اور ربوبیت کا مظہر تو آپ اپنے ہر سو دیکھ ہی رہے ہیں۔ خدا کی صرف ایک صفت خالق کا اقرار ہو جائے تو باقی تمام صفات بھی اسی طرح تسلیم کرنا منطقی طور پر ضروری ہوتا ہے۔

کائنات اور زندگی

اس دلیل سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کائنات کے نظام کو دیکھ کر ہر صاحب عقل و شعور یہی گواہ دیتا ہے کہ یہ کائنات ہماری زندگی کے قیام کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اگر یہ کسی اور طریقے سے بنی ہوتی تو یہاں انسان کی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ بعض لوگ اسے اتفاق کہتے ہیں مگر ہم بتائیں گے کہ اس اتفاق کا امکان خود ریاضی کے اصولوں کے مطابق نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نظریہ ارتقا نے ہم پر یہ حقیقت کھول دی ہے کہ کس طرح جاندار قدرتی ماحول میں اپنی نشو نما کے لیے نسل در نسل

لاکھوں برس میں مختلف سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں تاکہ وہ ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ یہ نظریہ تخلیق کی ترتیت تو بتادیتا ہے مگر سوال وہیں رہ جاتا ہے کہ آخر شعوری زندگی کا پہلا چشمہ کہاں سے پھوٹا؟

بعض تو یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کائنات کی توجیہہ کے لیے تخلیق کیا گیا تھا، مگر اب سائنس نے چونکہ ہم پر یہ انعام کردیا ہے کہ ہم کائنات کے نظام کو سمجھنے لگے ہیں اور ہمیں اس نظام کے لیے کسی خالق کی توجیہہ کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال تو یہ مغالطہ اس قدر کمزور ہے کہ اس کی تردید بھی نہ کرنی چاہیے، مگر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ مشین کے پرزے کس طرح کام کرتے ہیں، یہ جان لینا ہر گز یہ علم نہیں دیتا کہ اس مشین کا خالق کون ہے؟ اور کون اس مشین میں بجلی اور توانائی فراہم کررہا ہے؟

یہ خیال کہ زندگی کی حقیقت فنا ہے، اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں، اس کائنات کے اختتام پر کوئی باب شروع نہیں ہوگا، ایسا خیال ہے جو ہمیں نہ صرف حزن و ملال میں مبتلا کرسکتا ہے بلکہ ہمیں اس بات سے بھی بے فکر کردیتا ہے کہ زندگی کے اچھے برے اعمال کا انجام ہمارے لیے کیا ہوگا۔

مسلمانوں کا نشاۃ ثانیہ اور اس کا لائحہ عمل

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ ایک تابناک اور شاندار ماضی کی حامل رہی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں نے اپنی حیثیت منوائی ہے۔ نہ صرف تاریخ کی کتابیں اس حقیقت کی گواہ ہیں بلکہ بیگانے بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک دور ایسا گذرا ہے جب دنیا کی سیاسی، اخلاقی، سماجی اور تہذیبی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانانِ عالم ترقی کی اُس حد تک پہنچ گئے جس کی بلندی تاریخ بھی مکمل بیان کرنے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھ علم کی وہ شمع تھی جس سے راہ پاتے ہوئے انہوں نے ساری دنیا کو منور کیا اور صدیوں تک دنیا پر حکومت کرتے رہے۔ کسی قوم کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ مسلمانوں سے ٹکرائے۔ علم کے میدان میں، جنگ کے میدان میں، مہارت و ہنر کے میدان میں، غرضکہ زندگی کے ہر شعبے میں کارنامے انجام دیے۔ لیکن پھر حالات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی کہ یہ سب ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ آسمان کو چھوتا ہوا عروج زوال سے آشنا ہوا۔ اور قیادت مسلمانوں کے گھر سے ایسی نکلی کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آسکی۔ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ مسلمان ہر جگہ رسوا ہیں اور قیادت کرنے والی امت محکوم و مغلوب ہر کر رہ گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کا وعدہ ہے کہ اگر ہم ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو اللہ ہمیں عزت و وقار اور زمین کی خلافت عطا فرمائیں۔ لیکن مسلمان جو اب بھی ایمان رکھتے ہیں، کافی تعداد میں نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ ادا کرتے ہیں؛ اس کے باوجود حال یہ ہے کہ نہ خلافت حاصل ہے نہ دین کو مستحکم کرنے کی کوئی صورت۔ نہ عزت و وقار حاصل ہے نہ

کامرانی! نہ دین کو تمکن نصیب ہے نہ دشمنوں کو مرعوب کرنے کو کوئی ذریعہ۔ ہر جانب پستی ہی پستی ہے۔ خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا تو باجود اپنے ایمان پر قائم رہنے کے ہم مسلسل پستی کی جانب کیوں چلے جارہے ہیں؟ ہمیں خلافت و وقار کیوں حاصل نہیں؟

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس

کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات (اقبال)

اس وقت مغرب دنیا کی امامت کررہا ہے اور اس کی حکمرانی بالواسطہ ساری دنیا پر شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے۔ مغرب کی یہ شان و شوکت اور تہذیبی قیادت اچانک نمودار نہیں ہوئی، بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کی جدوجہد اور ایک ایسی ہمہ گیر علمی تحریک ہے جس نے اس پورے سفر میں ذہنی، فکری، مادی، علمی ہر لحاظ سے زندگی کے ہر شعبے پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے غور و فکر کرکے نتائج حاصل کیے ہیں۔ ہمیں بھی کسی شارٹ کٹ کی تلاش کے بجائے حکمت اور دانش مندی کے ساتھ لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ اس میں وقت ضرور لگے گا، لیکن یہ عروج مستحکم اور پائیدار ہوگا۔

اسبابِ زوال کے تعین میں سب سے سنگین غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے اس اجتماعی رُسوائی کا سارا ملبہ سیاسی اقتدار کی پامالی پر ڈال دیا اور نتیجتاً دین کی وہ سیاسی تعبیر سامنے آئی جس کا پورا مقصد و محور سیاسی اقتدار کا حصول بن گیا۔ بلکہ انبیاء کا بعیثت کا مقصد بھی اس تعبیر کے تحت یہی قرار پایا کہ انبیاء حکومتِ الٰہیہ قائم کریں۔ اصولی طور پر یہ بات بالکل

درست ہے کہ سیاسی اقتدار دعوتِ حق کی تلقین، اصلاح انسانیت، متوازن معاشرت اور عبادات الٰہی انجام دینے کے لیے بہترین موقع فراہم کرنے کا ناگزیر ذریعہ ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی اقتدار اسلام کا قطعی مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے زوال کا سبب سیاسی مغلوبیت ہے۔ اگر سیاسی اقتدار ہی مسلمانوں کے عروج کا پیش خیمہ ہوتی تو آج کتنے ہی آزاد مسلم ممالک امت کو عہدِ خلافت راشدہ کی یاد دلا دیتے۔ اگر مسئلہ اسلامی قوانین اور حدود و تعزیزات کا نفاذ ہوتا تو سعودیہ عرب آج ایک مثالی سلطنت ہوتی۔ بیسوی صدی میں ان تحریکوں کا آغاز ہوا تو امید تھی کہ مسلم ممالک کا پھیلتا ہوا آزادانہ سلسلہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا وقار واپس دلا دے گا، مجموعی طور پر یہ امت کے نوجوان احساس کمتری کی کیفیت سے باہر آئے، جس کا سہرا انھی تحریکوں کا جاتا ہے، لیکن کم و بیش ایک صدی بر سر عمل رہنے کے بعد بھی کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی ہے۔ ان تحریکوں کی یہ ناکامی اس بات پر دلیل ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب سیاسی جدوجہد سے نہیں بلکہ علم و تہذیب کی جدوجہد سے ہوگا۔ تاریخ واشگاف انداز میں شہادت دیتی ہے کہ الحادی فکر جو آج مغرب کی نمائندہ اور اُس تہذیب کی اصل روح رواں ہے، محض چند صدیوں پہلے پورے سماج میں سب سے زیادہ معتوب تھی۔ جو فکر آج دنیا پر راج کر رہی ہے سولہویں صدی تک وہ کمزور اور مظوم ترین فکر تھی۔ ان کے پاس نہ ہی قیادت تھی نہ ہی اپنے غلبے کا کوئی سامان۔ انھوں نے علم کی دنیا سے اپنے عروج اور غلبے کا راستہ بنایا اور چند نسلوں میں ہی پانسہ پلٹ کر ان کے حق میں ٹھہر گیا۔ ہمیں بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ مان لینا چاہیے کہ ہمارے درد کا حل سیاسی غلبے کے

بجائے ایمان و اخلاق اور علمی و دانش کی دنیا میں موثر لائحہ عمل ہے۔ ہم تاریخ کو دیکھتے ہوئے بھی کیوں اس بات کو ماننے سے قاصر ہیں کہ آج مغرب کے ہاتھ میں دنیا کی زمامِ اقتدار ہے تو اس کی وجہ ان کا سیاسی غلبہ نہیں بلکہ وہ علمی نشاۃِ ثانیہ ہے جس کی بنیاد انھوں نے پندرہویں صدی میں رکھی تھی۔

نیا تعلیمی نظام

تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ زوال کا اصل سبب مسلمانوں کی علم سے وہ بے توجہی ہے، جو سولہویں صدی کے بعد ان کے ذہنوں میں پیدا ہو گئی تھی اور وہ علم سے بے زار نظر آنے لگے تھے۔ مسلمانوں کی ذلت وخواری کا سبب اس سائنس اور ٹیکنالوجی سے چھٹکارا پالینا تھا، جو عہد وسطیٰ میں انہوں نے حاصل کی تھی اور جس کی بنا پر وہ ساری دنیا میں اپنا وقار اور معاشی برتری حاصل کئے ہوئے تھے۔ دین اور دنیا ساتھ لے کر چلنا ہی مسلمانوں کا قومی، ملی اور مذہبی فریضہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے دوری عالم اسلام کی بڑی محرومی ہے۔

علمی نشاۃ ثانیہ کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنے تعلیمی نظام پر غور کرنا ہو گا۔ اس وقت ہمارے ہاں دو قسم کے تعلیمی نظام موجود ہیں۔ نظام ہائے تعلیم کی ایک قسم وہ ہے جسے ہم عصری تعلیم کے ادارے کہتے ہیں۔ یہاں سائنسی و سماجی علوم کی تعلیم و ترویج کی جاتی ہے اور یہ نظام معاشرے کا وہ طبقہ پیدا کرتا ہے جسے عرف میں دنیادار طبقہ

کہا جاتا ہے۔ عصری اداروں کے فاضل طلباء کے ایمان وعقائد کے تزلزل کا حال کسی سے عیاں نہیں۔ بے خدا علوم سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بے خدا عالم پیدا کریں؟ یہ نظام سیکولر ہے اور اسی نظریے کو افراد کے ذہن میں راسخ کرتا ہے۔ دوسرا نظام مدارس کا ہے جہاں دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور مذہبی علماء بنائے جاتے ہیں۔ یہ طلباء اپنی زندگی کے آٹھ سال علوم دین پڑھتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ فراغت کے بعد جب وہ عملی دنیا میں اترتے ہیں تو انھیں دنیا کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ وہ تمام سماجی پیمانے جو طلباء مدرسے میں سیکھ کر نکلتے ہیں، اس بدلے ہوئے معاشرے میں قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتیں مگر وہ انھی پیمانوں سے سماج کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے ماحول میں پڑھتے ہیں، اور ایسی متغیر اقدار و روایات کے علم بردار بنتے ہیں جو عرصہ ہوا کہ ہمارے اصل معاشرے سے غایب ہو چکی ہیں۔

یہ قصہ دراصل اس تعلیمی روش کا حاصل ہے جو دین و دنیا کی تفریق پر مبنی ہے اور بحیثیت مجموعی اس وقت ہمارے تعلیمی نظام کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کیا ہم فی الواقع معاشرے کو مولوی اور مسٹر کے طبقے میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی درسگاہیں جو آج جدید علوم وفنون کی آماج گاہیں بن چکی ہیں، ماضی میں علومِ شریعہ کی ہی خاطر بنائی گئی تھیں مگر انھوں نے زمانے کے ضروریات کے مطابق اپنے علم کا سفر کیا اور ان کے نظامِ تعلیم کا دامن ہر گزرتے روز کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ خود ہمارے اسلاف کا تیار کردہ نصاب بھی دیکھا جائے تو اپنے زمانے کے اعتبار سے بلند ترین علمی سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ ہمارا موجودہ

تعلیمی نظام اس طرح کے ارتقائی عمل سے یکسر خالی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے دین و دنیا کی دوئیت کو اکھاڑ کر ایک ایسا نظامِ تعلیم متعارف کروانا ہوگا جہاں ایک طالب علم کو ابتدائی طور پر ایسی تعلیم فراہم کی جائے جس میں نہ صرف اس کے لیے ایمان و عقائد کے علاوہ مذہبی و قومی زبان کی مستحکم بنیادیں استوار ہوں، بلکہ اس کے بعد اسے وسعت حاصل ہو کہ وہ علومِ عصریہ یا علومِ دینیہ میں سے کسی ایک شعبے میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیمی شعبے کا انتخاب کرے۔ اس ماڈل کا مقصد تعلیم کو بے سمتی میں مبتلاء کرنا نہیں بلکہ طالبانِ علم کے لیے دین و دنیا میں سرفرازی کے راہیں کھولنا اور ہمارے تعلیمی نظام کی دوئیت کو ختم کرنا ہے۔ دینی مدارس کا وہ نظام جو درسِ نظامی کا نقیب ہے، اسے اسی مرحلے کے بعد ہونا چاہیے جس سے علومِ دینیہ کے وہ ماہرین پیدا ہوں جو قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد اور دینی رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔ اس اعلیٰ تعلیمی مرحلے سے گزرنے کے بعد فاضل کو امامت و خطابت کے بجائے تعلیم و تربیت اور تحقیق کے شعبے سے وابستہ ہونا چاہیے۔

جہاں تک دینی مدارس کے نصاب کا تعلق ہے تو اس کے نصاب میں ہر روز نئی پیوند کاری کے بجائے اس کے اہداف و مقاصد کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور جدید حالات کے تناظر میں اسے مرتب کیا جائے۔ اس وقت ہم جن اہداف و مقاصد کو لے کر چل رہے ہیں وہ کم از کم ایک صدی پہلے متعین کیے گئے تھے، یہ کیسے ممکن ہے کہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہمارے ہاں دینی تعلیم کے اہداف و مقاصد بالکل یکساں ہیں؟ لہٰذا سب سے پہلے مدارس کے لیے اہداف و مقاصد کو از سر نو متعین کیا جائے اور اس کی روشنی میں نصاب

اور اس سسٹم پر مکمل نظرِ ثانی کی جائے۔ اس حوالے سے ہمارے ذہن میں چند اہداف و مقاصد یہ ہیں:

- ہماری علمی و فکری حیات سے غیر اسلامی عناصر کو خارج کرنا
- علومِ جدیدہ بالخصوص سماجی علوم کو اسلامی سانچے میں از سر نو مرتب کرنا
- سماج کے مختلف طبقات کے لیے نئی لیڈر شپ تیار کرنا۔
- اختلاف کو ایک مثبت قدر کے طور پر متعارف کروانا
- مناظرانہ فضا کے بجائے علمی اور سنجیدہ اسلوبِ تحقیق اور دعوتی منہج کو فروغ دینا۔

علوم دینیہ کے طلباء کی ذہنی تربیت اور ایک نئے علمی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم مذکورہ نظامِ تعلیم میں تین کام لازماً کریں۔

- سب سے پہلے ان کے اذہان میں غیر متعصبانہ انداز میں دین کے بنیادی حقائق راسخ کیے جائے جو ہر قسم فقہی و فلسفیانہ موشگافیوں اور اضافی حاشیوں سے خالی ہوں۔
- وہ معاملات جن پر قرآن و سنت میں نص وارد نہیں، طلباء کو موقع دیا جائے کہ وہ ان معاملات پر مختلف ممکنہ تعبیرات و تشریح پیش کریں۔ یہاں اس مرحلے میں انھیں مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنا علمی نظریاتی ماڈل پیش کریں۔

- تیسرا کام ان تعبیرات پر مزید تحقیق و تنقید کا ہو جو اسلام اصولوں سے مطابقت رکھتے ہوں انھیں مستحکم بنیادوں پر تحقیقی انداز میں استوار کیا جائے۔

متبادل علمی پیراڈائم

اس ضمن میں سب سے پہلا کام علوم اور مطالعہ و تجزیہ کو ایک بنیاد فراہم کرنے کا ہے۔ ہمارے مسلم دانشور؛ بالخصوص وہ افراد جو فلسفۂ جدیدہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ جدید دور کے علمی رجحان اور جوہر (Episteme) کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں مسلم ذہن کے لیے ایک جدید علمی پیراڈائم تیار کریں جو مسلمانوں کے علمی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بن سکے۔ اس علمی پیراڈائم کا بنیادی خاکہ یہ ہو سکتا ہے:

- قرآن سے استمداد
- علوم کی کلیت
- مابعد الطبیعات سے عدمِ تعصب
- اصطلاحات کا نیا ڈھانچہ
- ناگزیر لچک

یہ کام اس قدر ضروری اور اہمیت کا حامل ہے کہ اگر یہ کام خدا کے ہاں مقبول ہو جائے تو کوئی بعید نہیں کہ نصف صدی کے اندر اندر مسلمان علم و ہنر کے میدان میں ساری دنیا کی قیادت کریں گے۔

سماجی علوم کی تشکیلِ نو

قرونِ وسطیٰ میں ہونے والے مذہب اور سائنس کے تنازع نے مغرب کو علمی سطح پر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خدا، روح اور حیات بعد الموت کو اپنے مادی سفر میں کہیں زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔ بظاہر یہ محض علمی اعراض ہے لیکن اس اصول کا نتیجہ لامحالہ یہی نکلا کہ غیر شعوری طور پر ایک مادہ پرستانہ علمی ڈسکورس منصۂ شہود پر آیا جس میں مذہبی مقدمات رفتہ رفتہ بالکل خارج ہو گئے۔ ہم مسلمان چونکہ علمی بالادستی کو قبول کر چکے ہیں اور اس وقت ہماری علمی قابلیت اس سطح پر نہیں پہنچ پائی ہے جہاں ہم کبھی ہوا کرتے تھے، اس لیے ہم ان علوم میں مغرب کے ہی ممنونِ کرم ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ہی سماج، اپنی ہی تہذیب اور اپنی ہی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے ان فرنگیوں کی جانب سر جھکانے پر مجبور ہیں جن کی غلامی کے طعنے ہم دن رات دیتے نہیں تھکتے۔ علمی اعتبار سے یہ بات اپنی جگہ قابل ملامت ہے کہ اپنے ہی سرمائے کی تفہیم میں ہم غیروں کی خوشہ چینی کے محتاج ہیں، لیکن اس سے بڑھ کر بھی باعث تشویش یہ ہے کہ ہم وہاں سے درآمد شدہ ہر ایک نظریے پر آمنا صدقنا آسمانی وحی کی طرح ایمان لے آتے ہیں۔ ہم اپنا مذہب، اپنی ثقافت، اپنی تاریخ اور اپنا معاشرہ مغرب کے تشکیل کردہ اس پیراڈائم میں

رکھ کر دیکھتے ہیں جس کے حاصل نتائج (outcome) صرف انسان پرستی کے گرد گھومتے ہیں اور اس نظامِ فکر میں ہمارے خدا اور اس کی پسندیدہ اقدار کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

موجودہ جدید ذہن کو دین سے برگشتہ کرنے اور مادہ پرستی کی جڑیں راسخ ہونے کی وجہ وہ کتب نہیں جو مذہب یا وجودِ خداوندی کے خلاف لکھی گئی، بلکہ سائنس و فلسفہ اور مختلف فنون پر وہ کتب ہیں جن کی بنیادیں مادیت پر استوار ہیں۔ یہ کتب بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، لیکن ان میں بیان کردہ نظریات بالواسطہ مذہبی مقدمات کو رد کر کے جدید ذہن کو اسی الحادی فکر پر ہی منتج کرتے ہی جو مغربی تہذیب کا خاصہ ہے۔ جب ایک طالب علم یہ پڑھتا ہے کہ جدید سائنس کے مطابق مذہب کا آغاز خوف سے ہوا ہے تو لا محالہ اس کا ذہن مذہب سے متعلق کسی بھی آسمانی عنصر کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص نفسیات کے باب میں یہ پڑھتا ہے کہ وحی کا دعویٰ کرنے والا شخص دراصل اپنے لاشعور سے ہی کا احکامات حاصل کرتا ہے، تو اس کا ایمان رسالت پر متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس طرح جدید علوم ایک ایسے انداز میں ایمان پر حملہ آور ہوتے ہیں جس کا اندازہ خود متاثر کو بھی نہیں ہوتا۔ اس وقت مغرب میں جس قدر الحاد پنپ رہا ہے اس کی بنیادی یہی سماجی علوم ہی فراہم کرتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم بھی سماجی علوم میں انھی کے خوشہ چین ہونے کی وجہ سے ان نظریات کو بعینہ نقل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مادیت زدہ افکار سے کسی خیر کی امید کرنا بے سود

ہے۔ نتیجتاً ہمارے ہاں جدید اداروں سے تعلیم یافتہ افراد بھی مغربی تعلیم کی بدولت اب مذہب کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوئے جارہے ہیں۔

اس صورت حال کا واحد حل یہی ہے کہ ہمارے اہل علم ان جدید علوم میں مہارت حاصل کریں اور ترجیحی بنیادیوں پر ان سماجی علوم کی تشکیلِ نو کا کام کریں اور ان علوم کو اسلامی پیراڈائم میں دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ نفسیات، بشریات اور معاشیات اس ضمن میں خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔

علومِ اسلامی کی تشکیل نو

علومِ اسلامی کی تشکیل سے مراد دین کی نئی تعبیر و تشریح نہیں بلکہ انھی سابقہ روایات کو پرزنٹیشن کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ غیر حقیقی، عملی زندگی سے غیر متعلق اور لایعنی مباحث کو نکال کر تمام علوم کو ریفائن کرنا ہوگا۔ اس میں نئے خیالات کو عزت و احترام کے ساتھ وہ جگہ دینی ہوگی جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔ ہمارے منابعاتِ اسلام کی اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ ساری نسلِ انسانیت کے لیے ایک دائمی دستورِ حیات ہے۔ ایک ایسا دستورِ حیات جس میں ہر زمانے کے مطابق مسائل کا حل موجود ہے۔ ہر دور کی اعلیٰ ترین علمی سطح کے مطابق اس کی توضیح و تشریح کی جاسکتی ہے۔ یہی کارنامہ دراصل ہمارے اسلاف نے بھی انجام دیا کہ انھوں نے اپنے زمان و مکان کے اعتبار سے اسلامی قوانین کی تدوین کی۔ ہم چونکہ اسلاف کی تقلید کے مدعی ہیں اور ان کے نقوش کو اپنے

لیے رہنمائی سمجھتے ہیں تو اب ہمیں اس درخت سے سایہ تلاش نہیں کرنا چاہیے جس کی شاخیں اب سوکھ رہی ہیں، جو صدیوں سے پانی کی بوند کو ترس رہا ہو۔ اسلاف کی تقلید کی حقیقی روح اور ہمارے موجودہ مسائل اسی کے متقاضی ہیں کہ ہم بھی اپنے بزرگوں کی تشریحات اور اپنے زمانے کی اعلیٰ ترین علمی سطح سامنے رکھتے ہوئے قانونِ اسلامی کی تدوین کریں جو جدید سماجی زندگی کے ہم آہنگ اور ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

اصلاح اور تزکیہ نفس کے لیے

تزکیہ نفس دین کی اصل روح اور مقصدِ حیات ہے۔ قرآن مجید کے مطابق انسان کے لیے کامیابی کا معیار یہی ہے کہ اپنے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے اپنے رب کے ہاں حاضر ہو۔ تزکیہ نفس کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہمارے ہاں سلسلہ تصوف بھی رائج ہے جس کی دینی حیثیت سے قطع نظر یہ کہنا بجا ہو گا کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ طریقہ تزکیہ نفس کے لیے انتہائی کار گر رہا ہے۔ تاہم اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کچھ خرابیاں بھی در آئی ہیں، نیز دورِ حاضر کے جدید ذہن کو بدلنے کے لیے بھی اس طریقِ اصلاح میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

اس وقت ہمارے ہاں اصلاح اور تزکیہ نفس کے لیے جو روایتی طریقہ رائج ہے، اس میں کچھ جدت لانا ضروری ہے۔ آج کا جدید ذہن اخلاقی قدر اور رذائل کے بارے میں انتہائی تذبذب کا شکار ہے، اسے یہ تو معلوم ہے کہ غیبت زنا سے بھی بدتر ہے ، مگر یہ نہیں معلوم کہ فی الحقیقت غیبت کس چیز کو کہتے ہیں؟ وہ بہت ایمانداری کے

ساتھ یہ مانتا ہے کہ تکبر ایک بہت بڑی برائی ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ تکبر کی کیا وجوہات اور علامات ہیں۔ وہ اخلاقیات کے بارے میں وعیدیں اور بشارتیں تو سن لیتا ہے لیکن اسے عملی زندگی میں اخلاقی اصولوں کو پریکٹس کرنے کے لیے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ آج جدید نفسیات نے بہت سے ذہنی رجحانات ہمارے سامنے واضح کر دیے ہیں اور اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک مکمل سسٹم بنا دیا ہے۔ ہم جدید نفسیات کے تمام تر اصولوں سے گو اتفاق نہیں کر سکتے لیکن اس میں بہت کچھ سامان ہمارے استعمال کے لیے موجود ہے جن سے ہمیں اصلاح اور تزکیہ نفس کے عمل میں فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر رذائل کو روحانی امراض سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح ہم ایک مرض کی وجوہات کا تعین کرتے ہیں، اس کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر اس کے علاج کے لیے حکمت عملی تیار کرتے ہیں، اس طرح تزکیہ نفس کے میدان میں بھی یہ طریقہ استعمال کرنا چاہیے۔ روایتی طرز کے ساتھ جدید Methodology کو بھی بھرپور زیر استعمال لایا جائے جس میں روحانی امراض کی تشخیص اور علاج ممکن ہو۔ اس کے لیے بہترین ماڈل ہمارے پاس علامہ غزالی اور امام رازی کی نفسیاتِ روحانی اور طب روحانی کا ہے۔ ان دونوں مفکرین نے اپنے دور کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ سطح کا کام پیش کیا ہے۔ موجودہ دور کے لحاظ سے اگرچہ ان کے کام پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، لیکن اسے بطور خطوط پیشِ نظر رکھا جانا چاہیے۔ سابقہ دور میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے عملی اعتبار سے ان دونوں مفکرین کے کام

سے بھرپور استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس کام میں ان کے اصلاحی خطبات اور موعظات کی اہمیت کلیدی ہے۔ جبکہ حالیہ دور میں ہی ڈاکٹر اظہر علی رضوی کی کتاب Muslim Tradition in Psychotherapy قابل مطالعہ ہیں جس میں اس تصور کو ٹھوس علمی بنیادیں فراہم کردی ہیں۔ ضروری ہے کہ اس کام کو نہ صرف علمی بنیادوں پر مزید آگے بڑھایا جائے بلکہ اسے عملی طور پر لاگو کیا جائے۔